ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دار الاسلام جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ عشر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کا صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت مجلد ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/-/۲ علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ (جولائی۔ اگست ۱۹۴۳ء) جلد ۲۳۔ عدد ۱۔۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ بہار، مشرقی یوپی اور بنگال کے ارکان جماعت اسلامی کے اجتماع کے لیے مقرر کی گئی ہے اور مقام اجتماع دربھنگہ تجویز ہوا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو میں تاریخ مقررہ پر دربھنگہ پہنچ جاؤں گا۔ مشرقی ہند کے ارکان جماعت زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی کوشش کریں۔ بجز اس کے کہ کسی شخص کے لیے کوئی معقول عذر ہو، ہر رکن کو اجتماع میں آنا چاہیے۔ جو لوگ شرکت کا ارادہ کریں وہ سید محمد حسنین صاحب (مکتبۂ اسلامی، لہریا سرائے، دربھنگہ) کو پہلے سے اپنے ارادے کی اطلاع دیدیں۔ بلا اطلاع اچانک پہنچ جانا مناسب نہیں ہے کہ اس سے منتظمین کو قیام وطعام کے انتظام میں زحمت ہوگی۔

اگرچہ جنگی حالات کی وجہ سے ہمیں اجتماع عام منعقد کرنے کے خیال کو مجبوراً ملتوی کر دینا پڑا ہے لیکن نظام جماعت کی ترقی و استحکام کے لیے بار بار اجتماعات کا منعقد ہونا، ارکان کا ایک دوسرے سے شخصی روابط قائم کرنا، امیر جماعت کا ارکان سے اور ارکان کا امیر جماعت سے شخصاً متعارف اور مانوس ہونا، تحریک کے معاونوں اور ہاتھوں کی صلاحیتوں کا صحیح جائزہ لینا اور انھیں باہمی تعاون کے ساتھ حرکت میں لانا کچھ اِس قدر ضروری ہے اور اس کے بغیر ہمارے کام میں اتنی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں کہ اجتماع کے مسئلے کو کسی غیر معین مدت کے لیے بالکل ساقط بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لیے مجبوراً یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ جب تک اجتماع عام منعقد کرنے کے لیے اسباب موافق نہ ہوں، اس وقت تک مختلف حلقوں کے الگ الگ اجتماعات وقتاً فوقتاً کیے جاتے رہیں

اس تجویز پر پہلا اقدام مشرقی ہند نے کیا ہے۔ اس کے بعد ہم کوشش کریں گے کہ پنجاب، مغربی یوپی اور دکن کے بھی حلقہ وار اجتماعات آئندہ سال کے دوران میں منعقد کیے جائیں۔

ان اجتماعات کی نوعیت اُن جلسوں سے بالکل مختلف ہوگی جو بالعموم ایسے موقعوں پر کیے جاتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی جلوس نکلے گا، نہ جھنڈا لہرایا جائے گا، نہ نعرے بلند ہوں گے، نہ پبلک کو جمع کرکے خطابت کی نمائش کی جائے گی اور نہ ایڈریس، ریزولیوشن اور ووٹ اور اس نوعیت کی دوسری چیزیں برسرِ کار آئیں گی۔ یہ خالص کارکنوں کے اجتماعات ہوں گے جن میں ارکانِ جماعت اور امیرِ جماعت بیٹھ کر صرف کام کی باتیں کریں گے اور جب اپنا کام ختم کرلیں گے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر منتشر ہو جائیں گے۔ تقریر کی جس حد تک واقعی ضرورت ہوگی، کی جائے گی مگر بلا ضرورت و بلا فائدہ ایک لمحہ بھی قوتِ گویائی کے اظہار و استعمال میں ضائع نہ کیا جائے گا۔

ان اجتماعات میں شریک ہونے والے ارکان کو حسبِ ذیل ہدایات کی پابندی کرنی چاہیے:

(۱) اجتماع کی شرکت کے لیے روانہ ہونے سے کافی مدت پہلے مقامی جماعتیں بطورِ خود سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان مسائل کا تعین کریں جنھیں وہ اجتماع عام میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اگر تحریک کی ترقی یا جماعت کی بہتری کے لیے کچھ تجاویز ان کے ذہن میں ہوں تو انھیں بھی مرتب کرلیں۔

(۲) اپنی مقامی جماعت کے اب تک کے کام کی رپورٹ تیار کرکے لائیں جس میں مبالغے اور بے جا انکسار سے کام لیے بغیر ٹھیک ٹھیک بتایا جائے کہ مقامی جماعت نے اب تک کس شعبے میں کیا کام کیا ہے؟ مقامی آبادی میں تحریک کا اثر کس حد تک پایا جاتا ہے؟ لٹریچر کی اشاعت کہاں تک ہوئی ہے؟ کس حد تک کس کس درجے میں لوگ تحریک سے متاثر ہوئے ہیں؟ رکاوٹیں کس نوعیت کی ہیں؟

(۳) ہر جماعت اپنے ارکان کی مکمل فہرست تیار کرکے لائے جس میں ہر رکن کی تعلیم، پیشے، مالی حالت

دماغی و جسمانی صلاحیتوں اور اخلاقی حالت کے متعلق ٹھیک ٹھیک تفصیلات درج ہوں نیز اگر کوئی رُکن کسی خاص فن سے واقفیت رکھتا ہو تو اس کی بھی تصریح کر دی جائے۔ اگر کہیں مقامی جماعت موجود نہ ہو اور کوئی رکن ابھی انفرادی حالت میں ہو تو اس رکن کو یا تو حتی الامکان خود شریکِ اجتماع ہونے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ اپنے متعلق مذکورہ بالا معلومات منتظم اجتماع کو لکھ کر بھیج دینی چاہییں۔

(۴) اجتماع کی شرکت کے لیے حتی الامکان جماعتی صورت میں سفر کیا جائے۔ بجز اس کے کہ کوئی ناگزیر صورت ہو، ارکانِ جماعت جدا جدا سفر کرنے سے پرہیز کریں۔ دورانِ سفر میں مسافروں کے ساتھ مزاحمت کرنے کے بجائے ان کی خدمت کی جائے۔ خود تکلیف اُٹھا کر لوگوں کو راحت پہنچائی جائے۔ پاکیزہ اخلاق، شیریں کلامی، ضبط و تحمل، اور ہمدردی و ایثار ہمارے ارکان کے وہ نمایاں اوصاف ہوں جن کی وجہ سے انھیں عام مسافروں کے مقابلہ میں شانِ امتیاز حاصل ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ بلا وجہ جماعت کے ذکر سے پرہیز کیا جائے۔ البتہ جہاں کہیں مناسب موقع ہو، مسافروں میں اپنے خیالات کی تبلیغ سلیقہ کے ساتھ کی جائے۔

(۵) اجتماع کے موقع پر تمام ارکان اپنی ضروریات جہاں تک ہو سکے خود فراہم کریں اور منتظمین اجتماع پر خرچ اور انتظامی دوڑ دھوپ کا کم سے کم بار ڈالیں۔

از نعیم صدیقی

اس پرچہ کی ترتیب رمضان سے پہلے تقریباً مکمل ہو چکی تھی، صرف "اشارات" باقی رہ گئے تھے کہ مدیر ترجمان القرآن اچانک طور پر بیمار پڑ گئے اور آپ کے ساتھ آپ کے بچے بھی بخار میں مبتلا ہو گئے۔ اس ناگہانی پیش آ جانے والی صورتِ حال کی وجہ سے محض اشارات کے انتظار میں پرچے کو ایک ہفتہ روکنا پڑا۔ باقی پرچہ چھپ چکا ہے لیکن اشارات اب تک لکھے بھی نہیں جا سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کی صحت بحال ہو نے

لگی ہے لیکن ضعف و نقاہت ابھی کہ پورے طور پر کام کو سنبھال لینے میں مانع ہے۔ آپ نے بمشکل اوپر کے چند پیرا گراف املا کرائے۔ مجبوراً اشارات کا جو پچھلا اہم سلسلہ چل رہا تھا اسے روک دینا پڑا ہے، اور بقیہ صفحات ایک دوسرے مضمون "اسلام اور اشتراکیت" سے پرچے کی عام ترتیب کے خلاف پُر کیے جا رہے ہیں جو آئندہ اشاعت کے لیے رکھا ہوا تھا۔

اس پرچے سے رسائل و مسائل کے پرانے مستقل عنوان کا احیاء کیا جا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے شعبہ تنظیم کے ماتحت خطوط کے جو جواب مرکز سے دیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر بے حد اہم ہوتے ہیں۔ ان میں تفسیر بھی ہوتی ہے، فقہ بھی، فلسفہ بھی ہوتا ہے اور ادب بھی۔ ہم نے سوچا ہے کہ یہ قیمتی سرمایہ صرف مستفسرین تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے عام تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیل جانا چاہیے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ ایک ہی سوال کو مختلف لوگوں کی طرف سے باربار پوچھنے کا جو سلسلہ جاری رہتا ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جماعت پر خط و کتابت کے مصارف کا بار کم ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ لوگ نہ صرف یہ کہ مختلف اصولی اور وقتی مسائل کو سمجھنے لگیں گے بلکہ ان کا نقطۂ نگاہ بھی رفتہ رفتہ سلجھ جائے گا

یہ سلسلہ سوال و جواب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ سوالات دونوں طرف سے حاشیہ چھوڑ کر باریک قلم سے لکھوائے گئے ہیں۔ ہر سوال کے نیچے اس کا جواب درج ہے۔ سوال اور جواب کے ایک ایک زوج کو ایک مناسب عنوان سے معنون کر دیا گیا ہے تاکہ جس خاص مسئلے کو قارئین چاہیں فہرست کی مدد سے برآمد کر سکیں۔

سوالات کی عبارت کے متعلق ایک ضروری بات یہ یاد رکھیے کہ یہ ضروری نہیں کہ سوال بالکل مستفسر کے الفاظ میں لکھا جائے اور اس کی چند وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ جو لوگ زبان پر قدرت نہیں رکھتے ان کے خطوط میں بے ربطی سی ہوتی ہے کسی خط میں تکرار پائی جاتی ہے اور کسی میں الفاظ کا مسرفانہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اختصار اور ربط کے لیے سوال کی عبارت میں تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ البتہ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ

مستفسر کا پورا مدعا سامنے آجائے۔ دوسرے یہ کہ بعض خطوط کے جواب تو ریکارڈ میں ملتے ہیں، لیکن اصل خطوط محفوظ نہیں ہیں۔ اس صورت میں سوال کو از سرِ نو بطورِ خود مرتب کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

یہ سلسلہ شروع کرنے کے ساتھ ہی یہ خیال ہو رہا ہے کہ ریکارڈ میں مولانا کے خطوط کی جو نقلیں موجود ہیں اُن کے مقابلہ میں ان خطوط کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی جن کی نقلیں موجود نہیں ہیں۔ مولانا کے احباب، ترجمان القرآن کے قارئین اور جماعت کے ارکین میں سے کتنے ہی اصحاب کے پاس آپ کے خطوط محفوظ ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے جماعتِ اسلامی کے شعبۂ تنظیم کی طرف سے یہ درخواست ہے کہ براہ کرم یا تو اصل خطوط عاریۃً ہمیں بھیج دیں ہم ان کی نقلیں حاصل کر لینے کے بعد واپس کر دیں گے، یا کم از کم ان کی نقول بھیج دیں، تاکہ انھیں سلسلہ وار شائع کر دیا جائے۔

یہ خطوط اگر انفرادی طور پر محفوظ رکھے گئے تو در اصل غیر محفوظ ہوں گے۔ لیکن اگر انھیں ترجمان القرآن میں شائع کر دیا گیا تو یہ ایک مستقل تاریخی سرمایہ کی حیثیت سے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچ سکیں گے۔ اور آنے والے عہد کا مورخ، موجودہ دور کے مسلمانوں کی ذہنی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے ان خطوط سے بڑی مدد لے سکے گا، نیز وہ اُس فکری ارتقاء کی سب سے بڑی کڑی کو پورے طور پر سمجھ سکے گا جو مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی کی تشکیل کر رہا ہے۔ پھر یہ خطوط مستقبل کے ان فقہاء کے لیے بھی مفید ہوں گے جو مجتہدانہ انداز سے اسلامی اصولوں کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرنے کے لیے فقہ کی جدید تدوین کی ہمت کریں۔

اشتراکیت اور اسلام

از محمد مظہر الدین صدیقی۔ بی۔ اے۔ حیدرآباد (دکن)

اشتراکیت کیا ہے موجودہ زمانہ میں اشتراکیت کی اصطلاح اس تحریک کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو ذاتی اور انفرادی ملکیت کو مٹا کر پیدائش دولت کے جملہ آلات و وسائل کو مملکت یا اسٹیٹ کے سپرد کر دینا چاہتی ہے۔ یہ تحریک موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا قدرتی ردِ عمل ہے جس میں افراد کی معاشی سرگرمیوں کو تمام اخلاقی اور معاشرتی قیود سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اشتراکیت سرمایہ داروں اور ان کے قائم کیے ہوئے معاشی نظام کی سخت دشمن ہے اور دنیا کی تمام معاشی برائیوں، سیاسی جھگڑوں اور اخلاقی خرابیوں کی ذمہ داری سرمایہ داری کے سر رکھتی ہے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کے معاشی نظام میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا جسے صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد صنعتی پیداوار کے طریقوں میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں اور بڑے پیمانہ پر پیدائش (LARGE SCALE PRODUCTION) کا طریقہ عام ہو گیا۔ بڑے پیمانہ پر صنعتوں کے قیام کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صنعتیں صرف وہی لوگ چلا سکتے تھے جن کے پاس کافی دولت تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ آلات اور مشینوں کی خریداری بھی متوسط درجہ کے افراد کے لیے دشوار تھی اس لیے رفتہ رفتہ معاشی نظام پر انھیں لوگوں کا قبضہ ہو گیا جو متمول طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے مزدور وغیرہ اپنے آلات اور اوزار خود خریدتے تھے اور یہ آلات انہی کی ملک ہوتے تھے لیکن اب آلات اور مشینیں اتنی پیچیدہ اور گراں ہو گئیں کہ مزدوروں کے لیے ان کا خریدنا بالکل غیر ممکن ہو گیا۔ اس طرح پیدائش دولت کے تمام آلات و وسائل سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں آگئے اور مزدور کے پاس اس کے

جسم و جان کے سوا کچھ نہ رہا۔ سرمایہ دار جس قیمت پر چاہتے مزدوروں کی محنت خرید لیتے تھے کیونکہ مزدور نہ اپنے پیشہ کے آلات و اوزار رکھتا تھا نہ اس کے پاس کوئی خانگی جائداد یا سرمایہ تھا جس سے وہ خود کوئی کاروبار کرسکتا۔ سرمایہ داروں نے اس طرح جو معاشی نظام قائم کیا اس میں ذاتی ملکیت کا حق اور بے قید مقابلہ کی آزادی یہ دو بڑے اصول کام کر رہے تھے۔

اس نظام کے حامیوں کا نظریہ یہ تھا کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل رہنا چاہیے کہ وہ جتنی دولت چاہے کمائے اور جتنی ملکیت چاہے حاصل کرے اور اس حق پر کوئی قید یا پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ موجودہ زمانہ میں حکومتوں نے جس قدر پابندیاں اور شرائط دولت کے جمع کرنے اور جائیداد کے حصول پر عائد کیے ہیں وہ سرمایہ داروں کے نزدیک ایک ناگزیر برائی کا درجہ رکھتے ہیں جسے بدرجۂ مجبوری قبول کیا جاسکتا ہے کیونکہ سرمایہ داری کے حامیوں کا خیال ہے کہ انسان کبھی کوئی کام پورے جوش و انہماک اور سرگرمی سے نہیں کرسکتا ہے جب تک اسے ذاتی فائدہ اور نفع کی توقع نہ ہو اور یہ اطمینان نہ ہو کہ اپنی محنت سے جو دولت وہ پیدا کرے گا وہ اسی کی ملک ہوگی اور اس کے صرف کرنے میں اس پر کوئی قید عائد نہ کی جائیگی۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں یہ نظام مقابلہ اور مسابقت (COMPETITION.) کے فوائد کا قائل ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر دولت کی پیدائش میں بہترین نتائج حاصل کرنا مقصود ہے تو ہر فرد کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنا معاشی کاروبار انجام دے۔ اس طرح افراد میں باہم دگر مقابلہ کی اسپرٹ پیدا ہوگی اور ہر شخص نفع حاصل کرنے کی غرض سے اپنی پوری اہلیت اور کارکردگی کو کام میں لائے گا کیونکہ اسے خوف رہے گا کہ اگر ذرا بھی اس سے سستی یا غفلت ہوئی تو دوسرے لوگ اس سے بازی لے جائیں گے۔

سرمایہ داری معاشی کاروبار میں حکومت کی مداخلت ناپسند کرتی ہے اور تجارت اور صنعت و حرفت میں ہر طرح کے قیود سے آزاد رہنا چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی امور میں بھی انفرادی آزادی کی حامی ہے۔ کیونکہ انفرادی آزادی کا حق وہ ہتھیار ہے جس سے سرمایہ دار طبقہ معاشی نظام کو حکومت کی دستبرد سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف

اشتراکی تحریک غیر محدود مسابقت اور مقابلہ کی خرابیوں کو پیش کرتی ہے اور اس کی وجہ سے سوسائٹی کے غریب اور غیر مستطیع افراد کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تعلیم دیتی ہے کہ جب تک ذاتی ملکیت کے حصول پر مناسب قیود نہ عائد کیے جائیں گے دنیا میں ہمیشہ بے چینی اور افلاس کا دور دورہ رہے گا۔ کیونکہ تجارت اور صنعت و حرفت میں بے قید مقابلہ کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کا پہلے سے وسائل دولت پر قبضہ ہے وہ مزید دولت حاصل کرتے جائیں اور جو پہلے سے غریب ہیں وہ اور غریب ہوتے جائیں۔ کیونکہ مقابلہ میں ان کا ناکام رہنا یقینی ہے۔ اس لیے اشتراکی کہتے ہیں کہ اجتماعی پیداوار کے ذرائع اور پیدائش دولت کے آلات کو افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں لے آنا چاہیے تاکہ ان آلات و وسائل پر کسی خاص گروہ یا طبقہ کا قبضہ نہ رہنے پائے بلکہ جملہ افراد ان سے یکساں اور مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے گھر چراغ جلیں اور کسی کو دو وقت روٹی بھی نہ نصیب ہو۔

اشتراکیت حصول دولت کے ذرائع کو مملکت کے قبضہ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اور اسی طرح افراد ملک کی اجتماعی کوششوں سے مجموعی طور پر جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کی تقسیم کو بھی مملکت کے سپرد کر دینا چاہتی ہے۔ تاکہ مجموعی دولت کی تقسیم انصاف کے ساتھ ہو اور ہر شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق اس کا حصہ ملے۔ اشتراکیت معاشی اونچ نیچ اور طبقاتی امتیازات کی دشمن ہے۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی کے قیام پر زور دیتی ہے جس میں طبقوں کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی نظر میں مختلف طبقوں کا وجود ہی ظلم اور ناانصافی کا اصلی سبب ہے۔

ان امور و مقاصد کی حد تک تمام اشتراکی کم و بیش متفق ہیں۔ لیکن جہاں تک حصول مقصد کے لیے ذرائع اختیار کرنے کا سوال ہے اشتراکیوں میں باہمد گر سخت اختلاف رائے ہے۔ اور اسی اعتبار سے اشتراکیت کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ انقلابی اشتراکیت اور ارتقائی اشتراکیت۔ ان دونوں میں خاص فرق یہ ہے کہ ارتقائی اشتراکی معاشی مساوات کے قیام میں رائج الوقت جمہوری نظام ہی سے کام لینا چاہتا ہے

وہ کہتا ہے کہ موجودہ جمہوری مملکت پر جیسی کچھ وہ ہے اشتراکی خیال کے افراد کو قبضہ کر لینا چاہیے اور وہ اس طرح سے کہ پارلیمنٹ اور مجالس قانون سازمیں پروپیگنڈے کے ذریعہ اشتراکی پارٹی اکثریت حاصل کرلے۔ اس کے بعد حکومت کی باگ ڈور لامحالہ اشتراکیوں کے قبضہ میں آجائے گی۔ اور وہ اپنے اقتدار کو استعمال کرکے تدریجی طور پر سوسائٹی کو اشتراکی قالب میں ڈھال لے گی۔ ارتقائی اشتراکیت تدریجی اصلاح کی قائل ہے۔ اور چاہتی ہے کہ پارلیمنٹوں اور مجالس قانون سازمیں اکثریت حاصل کرکے اپنے مقاصد پورے کرے۔ اور رفتہ رفتہ ذاتی ملکیت کو محدود کرکے اجتماعی پیداوار کے آلات و وسائل حکومت کے قبضہ میں لے آئے۔

انقلابی اشتراکیت جس کا دوسرا نام اشتمالیت یا کمیونزم ہے اس طریقۂ کار کی شدت سے مخالف ہے کیونکہ وہ موجودہ سیاسی و جمہوری نظامات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے۔ اشتمالی یعنی کمیونسٹ کہتے ہیں کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری نظام میں اکثریت حاصل کرکے اشتراکی اصولوں کے مطابق سوسائٹی کی تشکیل ایک خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس نظام کے اندر رہ کر اشتراکی مقاصد کے حصول کی کوشش بے معنی ہے کیونکہ یہ نظام تو سرمایہ داروں کا ساختہ پرداختہ اور انھیں کے مفاد کا محافظ ہے جب تک یہ نظام باقی رہے گا سرمایہ داروں کا غلبہ بھی باقی رہے گا اور معاشی اصلاح کی تمام کوششیں لازمی طور پر سرمایہ داروں کے مفاد کی تلچھٹ رہیں گی۔ اگر صحیح معنوں میں اشتراکی سوسائٹی کی تشکیل کا کام انجام دینا ہے تو رائج الوقت سیاسی اور جمہوری نظامات کو برباد کرنا اور مٹانا ہوگا۔ تب ہی اشتراکی اصول دنیا میں رائج ہوسکیں گے۔ انقلابی اشتراکیت کا سب سے بڑا فلسفی کارل مارکس نامی ایک جرمن یہودی تھا۔ اس لیے اشتمالی تحریک یا کمیونزم کو سمجھنے کے لیے مارکس کے فلسفہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

کارل مارکس کا فلسفہ

کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر معاشی نظام اپنے دَور کی پوری زندگی کا سنگِ بنیاد ہوتا ہے اور وہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اُس کے ذریعہ سوسائٹی کی معاشی ضروریات بلاکسی دقت یا رکاوٹ کے پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب کہ سوسائٹی کا معاشرتی ماحول اور

ان تعلقات کی نوعیت جو سوسائیٹی کے ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ کے مابین قائم ہوتے ہیں، معاشی نظام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ نئی نئی ایجادات کی وجہ سے آفرینشِ دولت کے طریقوں میں تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے وہ طبقاتی تقسیم متاثر ہونی شروع ہوتی ہے جس پر سوسائیٹی اب تک قائم تھی۔

مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانہ میں معاشی کاروبار کی نوعیت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ سماج میں مختلف طبقات مختلف فرائض انجام دیں۔ اور اپنے فرائض کی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے مجموعی دولت میں حصہ دار بنیں۔ اس طرح معاشی نظام ہی کی بدولت سوسائیٹی چند در چند طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جس میں سے ہر طبقہ اپنے مقررہ فرائض انجام دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ایک مقررہ معیار کے مطابق اس کی قانونی اور سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر زمانہ کا قانونی اور سیاسی نظام اُن سماجی تعلقات اور طبقاتی امتیازات کا محافظ ہوتا ہے جن کے ذریعہ مختلف طبقوں کی معاشرتی اور سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ اور جب کبھی کوئی طبقہ اپنی متعینہ حیثیت کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو رائج الوقت قانونی اور سیاسی نظام اس کی مخالفت کرتا ہے۔

ابتداء میں سوسائیٹی کا معاشرتی نظام اور اس کی طبقاتی تقسیم معاشی نظام کی کارکردگی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنے میں لیکن ایک خاص مدت کے بعد معاشی نظام اور معاشرتی تعلقات کی یہ ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے اور معاشی نظام کے اندر سے ایسی قوتیں نمود کرتی ہیں جو رائج الوقت معاشرتی تعلقات اور طبقاتی تقسیم کو بدلنا چاہتی ہیں۔ یا یوں کہیے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد معاشرتی اور سماجی تعلقات کی رائج الوقت شکل وصورت پیدائش دولت کے کام میں مزاحم ہونے لگتی ہے۔ اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں غالب معاشی طبقات ایک طرف ہوتے ہیں اور مغلوب ومظلوم طبقات دوسری طرف۔ چونکہ ریاست وحکومت پر اول الذکر طبقات کا قبضہ ہوتا ہے اور قانون بھی انہی کی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے اس لیے یہ طبقے اپنی پوری قوت اور وسائل کے ساتھ رائج الوقت معاشرتی نظام اور طبقاتی تقسیم کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے طبقے سماجی تعلقات کی رائج الوقت صورت میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور

بالآخر کامیاب ہوتے ہیں۔

کارل مارکس کے نزدیک پوری تاریخ سوا اس زمانہ کے جب زندگی بالکل ابتدائی شکل میں تھی مختلف معاشرتی طبقوں کی جنگ کا قصہ ہے۔ معاشی اور معاشرتی نشوونما کے طریقہ کو کارل مارکس نے یورپ کی تاریخ سے ایک مثال دے کر واضح کیا ہے۔ پندرھویں صدی میں جاگیرداری نظام رائج تھا اور وہی معاشرتی نظام کی بنیاد تھا۔ رفتہ رفتہ تجارت کو فروغ ہوا۔ نئے ملک دریافت کیے گئے۔ بحری سفر کے نئے راستے معلوم کیے گئے اور اس کے خطرات کم ہو گئے اس کی وجہ سے معاشی نظام میں یہ فرق پیدا ہوا کہ ایک طبقہ سرمایہ داروں کا نمودار ہوا جس نے ایک طرف تو قرون وسطی کے دستکاروں کو مزدور بنا دیا اور دوسری طرف تجارت کے نئے ذریعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی دولت بہت بڑھا لی لیکن معاشرتی اور سیاسی نظام میں اس طبقہ کو جو حیثیت حاصل ہونا چاہیے تھی وہ اسے حاصل نہیں ہوئی اور معاشرے اور ریاست پر شرفاء اور امراء قابض رہے۔ اس سبب سے ان دونوں میں مخالفت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ لڑائی کی نوبت آگئی۔ بالآخر فرانسیسی انقلاب میں سرمایہ داروں کے طبقے کو شرفاء اور امراء پر فتح حاصل ہوئی مگر اس دوران میں صنعتی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں مشینیں ایجاد ہوئیں۔ کارخانے قائم ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ایک نیا طبقہ مزدوروں کا پیدا ہو گیا۔ سرمایہ داروں نے شرفاء پر فتح پانے کے بعد معاشرتی زندگی پر اسی طرح قبضہ کر لیا جیسے پہلے شرفاء اور امراء نے کیا تھا اور اپنا قبضہ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے فائدے کیلیے وہ مزدوروں پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے ہیں لیکن مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ رہی ہے۔ سرمایہ داری کے نظام کو جتنی ترقی ہوگی اتنی ہی انکی تعداد اور بھی بڑھتی جائیگی اور ان کا افلاس بھی بڑھیگا۔ آخر میں وہ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ متحد ہو کر سرمایہ داروں کا مقابلہ کریں۔ اس جنگ میں ان کی کامیابی یقینی ہے اور انکی کامیابی کیساتھ ایک نیا معاشی نظام قائم ہوگا جو صنعتی پیداوار کے نئے طریقوں کے مطابق ہوگا۔

مارکس کا خیال ہے کہ مزدوروں کی فتح کے بعد سوسائٹی پر ایک درمیانی مدت گذریگی جسمیں مزدوروں کی آمریت قائم ہوگی۔ اس آمریت کے ذریعہ طبقاتی امتیازات کو مٹایا جائیگا اور پیدائش دولت کے تمام وسائل، تمام جائیدادیں اور املاک افراد کے ہاتھ سے چھین کر حکومت کو دیدی جائینگی۔ اسطرح جب طبقاتی تقسیم بالکل معدوم ہو جائیگی تب آمرانہ حکومت از خود اپنے وجود کو ختم کر دیگی۔ اور بغیر کسی حکومتی قدغن کے انسان اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے لگیگا کیونکہ مارکس کے نزدیک حکومت ہمیشہ غالب معاشی طبقوں کے مفادات کی حفاظت کا کام انجام دیتی ہے جب طبقات ہی باقی نہ رہینگے تو حکومت کا وجود بھی غیر ضروری ہو جائیگا صحیح معنوں میں اشتراکی سوسائٹی اسی وقت وجود میں آئے گی جب حکومت اور مملکت وجود مٹ چکا ہوگا باقی آئندہ

تفہیم القرآن

(۱۲)

المائدہ

(از نصف رکوع ۶ تا نصف رکوع ۱۳)

اے پیغمبرؐ! تمھارے لیے باعثِ رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں[1]، خواہ وہ اُن میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے، یا اُن میں سے جو یہودی بن گئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لیے کان لگاتے ہیں[2] اور دوسرے لوگوں کی خاطر، جو

---

[1] یعنی جن کی ذہانتیں اور سرگرمیاں ساری کی ساری اس کوشش میں صرف ہو رہی ہیں کہ جاہلیت کی جو حالت پہلے سے چلی آرہی ہے وہی برقرار رہے اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اس بگاڑ کو درست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی رکیک سے رکیک چالیں چل رہے تھے، جان بوجھ کر حق نگل رہے تھے اور نہایت بے باکی و جسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اُس پاک انسان کے کام کو شکست دینے کی کوشش کر رہے تھے جو کامل بے غرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بنا پر عام انسانوں کی اور خود اُن کی فلاح و بہبود کیلیے شب و روز محنت کر رہا تھا۔ ان کی ان حرکات کو دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کڑھتا تھا، اور یہ کڑھنا بالکل فطری امر تھا۔ جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ محض اپنی جہالت اور خود غرضی و تنگ نظری کی بنا پر اُس کی خیر خواہانہ مساعی کو روکنے کے لیے گھٹیا درجہ کی چالبازیوں سے کام لیتے ہیں تو فطرۃً اس کا دل دکھتا ہی ہے۔ پس اللہ تعالےٰ کے ارشاد کا منشا یہ نہیں ہو کہ ان حرکات پر جو فطری رنج آپ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ منشا دراصل یہ ہے کہ اس سے آپ دل شکستہ نہ ہوں، ہمت نہ ہاریں۔ صبر کے ساتھ بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کیے چلے جائیں، رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انھوں نے اپنے اندر پرورش کیے ہیں اُن کی بنا پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز ان کی اِس روش میں خلاف توقع نہیں ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

تمھارے پاس کبھی نہیں آئے، سن گن لیتے پھرتے ہیں[1]، کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں[2] اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔[3] جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لیے تم کچھ نہیں کرسکتے[4] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا،[5] ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

(بقیہ سابق) ؎ اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ یہ لوگ چونکہ خواہشات کے بندے بن گئے ہیں اس لیے سچائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، جھوٹ ہی انھیں پسند آتا ہے اور اسی کو یہ جی لگا کر سنتے ہیں کیونکہ ان کے نفس کی پیاس اسی سے بجھتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں جھوٹ کی غرض سے آکر بیٹھتے ہیں، تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور جو باتیں سنیں ان کو اُلٹے معنی پہنا کر یا ان کے ساتھ اپنی طرف سے غلط باتوں کی آمیزش کر کے آنحضرت اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کریں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں اس لیے گشت لگاتے پھرتے ہیں کہ کوئی راز کی بات کان میں پڑے تو اسے آپ کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے مواد فراہم کرتے پھرتے ہیں تاکہ اُن لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

[2] یعنی توراۃ کے جو احکام ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں، ان کے اندر جان بوجھ کر ردوبدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنی بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں۔

[3] یعنی جاہل عوام سے کہتے ہیں کہ جو حکم ہم بتا رہے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی حکم تمھیں بتائیں تو اسے قبول کرنا ورنہ رد کر دینا۔

[4] اللہ کی طرف سے کسی کے فتنہ میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ کسی قسم کے بُرے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے اس کے لیے پے در پے مواقع ایسے پیدا کرتا ہے جن میں اس کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اگر وہ شخص ابھی برائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمائشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔سلہ لہٰذا اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کردو۔ انکار کردو تو یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔سکہ اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے،

(بقیہ سابق) بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں موجود ہوتی ہیں وہ ابھر آتی ہیں۔ لیکن اگر وہ برائی کی طرف پوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی سے اندر ہی اندر شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر آزمائش کے موقع پر وہ اور زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی بگڑتے ہوئے انسان کو بچا لینا اس کے کسی خیر خواہ کے بس میں نہیں ہوتا۔

شہ اس لیے کہ انھوں نے خود پاک ہونا نہ چاہا۔ جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہو اسے پاکیزگی سے محروم کرنا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ اللہ پاک کرنا اسی کو نہیں چاہتا جو خود پاک ہونا نہیں چاہتا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) سلہ یہاں خاص طور پر اپنے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھوٹی شہادتیں لے کر اور جھوٹی رودادیں سن کر اُن لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی۔

سکہ یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور ان کے معاشرتی مقدمات کے فیصلے انہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لانے کے لیے وہ ازروئے قانون مجبور نہ تھے، لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا نہ چاہتے تھے ان کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر آتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ توراۃ کی رو سے ان کی سزا رجم تھی (یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے) (باقی اگلے صفحہ پر)

اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں[۱]؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔

(بقیہ سابق) لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ اس پر آپ نے پوچھا تمھارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپ نے ان کے علماء کو قسم دے کر ان سے پوچھا، کیا توراۃ میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابن صوریا، جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں توراۃ کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طور پر تمھیں شریعت عطا کی، کیا واقعی توراۃ میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر ہم نے توراۃ کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہیں رہی اور آپ کے حکم سے زانی و زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ "مذہبی لوگ" جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علمِ کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے اُس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو ابتداً انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے۔ جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے، اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔

ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی، جو مسلم تھے، اسی کے مطابق ان یہودی بن جانے والوں[1] کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربّانی اور احبار[2] بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے پس (اے گروہِ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو، جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ[3]، پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے[4]، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا، اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی

---

[1] یہاں ضمناً اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیا گیا کہ انبیاء سب کے سب "مسلم" تھے، بخلاف اس کے یہ یہودی "اسلام" سے ہٹ کر اور فرقہ بندی میں مبتلا ہو کر صرف "یہودی" بن کر رہ گئے تھے۔

[2] ربّانی = علماء۔ احبار = فقہاء

[3] خروج باب ۲۱ - آیت ۲۳ - ۲۵۔

[4] یعنی جو شخص صدقہ کی نیت سے قصاص معاف کر دے اس کے حق میں یہ نیکی اس کے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔ اسی معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ من جرح فی جسدہ جراحۃ فتصدق بھا کفر عنہ ذنوبہ بمثل ما تصدق بہ۔ یعنی جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا تو جس درجہ کی یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی[1] اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اُس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔[2]

---

[1] یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین جو تمام پچھلے انبیاء کا دین تھا، اُسی کی طرف دعوت دینے کے لیے وہ بھی آئے تھے، اس لیے توراۃ کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانہ میں محفوظ تھا اس کو مسیح علیہ السلام بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی۔ قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء دنیا کے کسی گوشے میں آئے ان میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاء کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاء کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کو فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے انھوں نے ایک پاک ورثہ کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدق تھی۔

[2] یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں، تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا مطلب صاف ہے۔ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کے خلاف اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب وہ اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کرتا ہے تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالتا ہے اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں، ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی[۷۵] اور اس کی محافظ و نگہبان[۷۶] ہے۔ لہٰذا تم خدا

(بقیہ سابق) ظالم اور فاسق ہے، اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے، اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان و اسلام اور کفر و ظلم و فسق کی آمیزش ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ آپ سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اُن میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مرۃ ولکم کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک۔ "کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔"

(حواشی صفحہ ہذا) [۷۵] یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ "پچھلی کتابوں" میں سے جو کچھ اپنی اصلی اور صحیح صورت پر باقی ہے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے "پچھلی کتابوں" کے بجائے "الکتاب" کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں، ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے، اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعہ سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں، موید ہیں، تردید کرنے والی نہیں تصدیق کرنے والی ہیں، بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے کہ یہ سب ایک ہی "الکتاب" کے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے[۷۹] تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک واضح راہِ عمل مقرر کی۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اُس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو[۸۰]۔ پس اے محمد[۸۱]! تم اللہ کے نازل کردہ

(بقیہ سابق) مختلف ایڈیشن ہیں۔

[۷۸] اصل میں لفظ "مُھَیْمِنْ" استعمال ہوا ہے۔ عربی میں ھیمن یھیمن ھیمنۃ کے معنی محافظت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ ھیمن الرجل الشیئ یعنی آدمی نے فلاں چیز کی حفاظت و نگہبانی کی۔ ھیمن الطائر علیٰ فرخہ، یعنی پرندے نے اپنے چوزے کو اپنے پروں میں لے کر محفوظ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا انی داع فھیمنوا، یعنی میں دعا کرتا ہوں تم تائید میں آمین کہو۔ اسی سے لفظ ہمیان ہے جسے اردو میں ہمیانی کہتے ہیں، یعنی وہ تھیلا جس میں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو "الکتاب" پر مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیماتِ برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کا مؤید ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۷۹] جملہ معترضہ ہے جس سے مقصود ایک سوال کی توضیح کرنا ہے جو اوپر کے سلسلۂ تقریر کو سنتے ہوئے مخاطب کے ذہن میں الجھن پیدا کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام انبیاء اور تمام کتابوں کا دین ایک ہے اور یہ سب ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے آئے ہیں تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ عبادت (باقی اگلے صفحہ پر)

قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہشیار رہو کہ

(بقیہ سابق) کی صورتوں میں، حرام اور حلال کی قیود میں اور قوانین تمدن و معاشرت کے فروع میں مختلف انبیاء، اور کتب آسمانی کی شریعتوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؟

ؔ یہ مذکورہ بالا سوال کا پورا جواب ہے۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) وہ اللہ تعالیٰ ہی تھا جس نے مختلف قوموں کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے مقرر کیے، لہٰذا انسانوں کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو الگ کر کے وہ تمام اصل ضوابط جو اللہ نے مقرر کیے تھے، اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے دور کے لیے لکھے گئے تھے۔

(۲) یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک امت بنا دیا جاتا لیکن یہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کی شریعتوں کے درمیان رکھا اس کے اندر دوسری بہت سی مصلحتوں کے علاوہ ایک بڑی مصلحت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگ اصل دین اور اس کی روح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور دین میں ان ضوابط کی جو حقیقی حیثیت ہے اس کو جانتے ہیں اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں وہ حق کو جس صورت میں بھی وہ آئے گا پہچان لیں گے اور قبول کر لیں گے اور ان کو اللہ کے بھیجے ہوئے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے جو لوگ روح دین سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، اور جنھوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصب اختیار کر لیا ہے وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو ممیّز کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔

(۳) تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو پانا ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکم خدا ہو اس کی پیروی کی جائے، لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے فروق پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طریق یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو۔

(۴) جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی اُپج سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلسِ مناظرہ میں ہو سکتا ہے نہ میدانِ جنگ میں، آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جبکہ حقیقت (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر[1] اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔
پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت
کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے
منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ[2] چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اُن کے نزدیک
ع اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔

اے ایمان لانے والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے
رفیق ہیں، اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو[3] اپنی

(بقیہ سابق) بے نقاب کر دی جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں وہ عمریں کھپا کر دنیا سے آئے ہیں ان کی تہ میں "حق" کا جوہر کتنا تھا اور باطل کے حاشیے کس قدر۔

یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر چل پڑتا ہے جو اوپر سے چلا آرہا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی اپنی چال بازیوں سے تم کو دھوکہ دے کر۔

[2] جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانۂ قبل اسلام کو جاہلیت کا دَور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم یا قیاس و گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرزِ عمل جہاں جس دور میں بھی انسان اختیار کریں اسے بہرحال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک جزوی علم ہے اور کسی معنی میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے لہٰذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر اس جزوی علم کی مدد سے ظنون و اوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کے ساتھ جو طریقے اختیار کر لیے گئے ہیں وہ بھی اسی طرح "جاہلیت" کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اس تعریف میں آتے تھے۔

[3] یعنی اُن لوگوں کو جو خدا کی طرف سے شدید ممانعت اور تنبیہ کے باوجود پھر انہی لوگوں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں کہتے ہیں "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں"[۱]۔ مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا[۲] تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں نادم ہوں گے۔ اور اُس وقت اہلِ ایمان کہیں گے "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟" — ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامراد ہو کر رہے[۳]۔

(بقیہ سابق) دوستی و رفاقت کا رشتہ جوڑیں جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دینِ حق کے دشمن ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اُس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کشمکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیروؤں کی سرفروشیوں کے سبب سے ایک طاقت بن چکا تھا لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں اور اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا۔ اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھنا چاہتے تھے تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ علاوہ بریں اُس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی معاشی قوت سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارہ بیشتر انہی کے ہاتھوں میں تھا، عرب کے بہترین سرسبز و شاداب خطے ان کے قبضہ میں تھے۔ اور ان کی سود خواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا معاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلقات برقرار رکھنے کے خواہشمند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کشمکش میں ہمہ تن منہمک ہو کر ہم نے اُن سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرِ پیکار ہے تو یہ فعل سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔

[۲] یعنی فیصلہ کن فتح سے کم تر درجہ کی کوئی ایسی چیز جس سے عموماً لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ ہار جیت کا آخری فیصلہ اسلام ہی کے حق میں ہوگا۔

[۳] یعنی جو کچھ انہوں نے اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہتیرے لوگ ایسے پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے،[۱] جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔[۲] یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

(بقیہ سابق) جہاد میں شریک ہوئے، قوانین اسلام کی اطاعت کی، یہ سب کچھ اس بنا پر ضائع ہوگیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا اور وہ سب سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو کر نہ رہ گئے تھے بلکہ اپنی دنیا کی خاطر انھوں نے اپنے آپ کو خدا اور اس کے باغیوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹ رکھا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "مومنوں پر نرم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہل ایمان کے مقابلہ میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے۔ اس کی ذہانت، اس کی ہشیاری، اس کی قابلیت، اس کا رسوخ واثر، اس کا مال اور اس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ بلکہ مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان پائیں۔

"کفار پر سخت" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کی پختگی، دینداری کے خلوص، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفینِ اسلام کے مقابلہ میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے۔ وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے اُن پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا۔

[۲] یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اس کے احکام پر عملدرآمد کرنے میں اور اس دین کی رو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہوگا۔ کسی کی مخالفت، کسی کے طعن وتشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر میں نکو بنا لینے کے ہوں تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچے دل سے حق جانتے ہیں۔

تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کو اپنا
ع ۸ رفیق بنالے، تو معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت یقیناً غالب رہنے والی ہے۔

اے ایمان لانے والو! تمھارے پیش رو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں[1]، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے[2]۔ ان سے کہو، "اے اہلِ کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہوئے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟" پھر کہو "کیا میں ان لوگوں کی نشان دہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟ وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ٹوٹا، جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے، جنھوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ اُن کا درجہ اور بھی زیادہ بُرا ہے اور وہ "سواء السبیل" سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں"[3]۔

---

[1] یعنی اذان کی آواز سن کر اس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر کے لیے اس کے الفاظ بدلتے اور مسخ کرتے ہیں اور اس پر پھبتیاں کستے ہیں۔

[2] یعنی ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی خفیف حرکات ان سے سرزد نہ ہوتیں۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کر سکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے منادی کرے تو اس کا مذاق اُڑایا جائے۔

[3] لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف، جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بارہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں، حتیٰ کہ وہ تنزل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انھیں نصیب ہوئی۔ پس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمھاری (باقی اگلے صفحہ پر)

جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ انھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی بڑا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[۱] ـــ باندھے گئے ان کے ہاتھ[۲]، اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں[۳] ـــ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں

(بقیہ سابق) بے حیائی اور مجرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لا کر سچی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے۔ پس یہودیوں کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلت و نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گذشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انہیں نظر نہ آتا تھا، اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا تو بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک ہی محدود نہیں، دوسری قوموں کے جہلاء کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

[۲] یعنی بخل میں یہ خود مبتلا ہیں۔ دنیا میں اپنے بخل اور اپنی تنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کی سرکشی و باطل پرستی میں اُلٹے اضافہ کا موجب بن گیا ہے[۱۸] اور (اس کی پاداش میں) ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انھوں نے توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا[۲۰] جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، ایسا کرتے تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔

اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمھارے مقابلہ میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھلائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل

(بقیہ سابق) [۱۷] یعنی اس قسم کی گستاخیاں اور طعن آمیز باتیں کر کے یہ چاہیں کہ خدا ان پر مہرباں ہو جائے اور عنایات کی بارش کرنے لگے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں بلکہ ان باتوں کا اُلٹا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی نظر عنایت سے اور زیادہ محروم اور اس کی رحمت سے اور زیادہ دور ہوتے جاتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۸] یعنی بجائے اس کے کہ اس کلام کو سن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے، اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر متنبہ ہو کر ان کی تلافی کرتے اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے، ان پر اس کا اُلٹا اثر ہوا ہے۔ ضد میں آ کر انھوں نے اور زیادہ شرارتیں شروع کر دی ہیں۔ خیر و صلاح کے بھولے ہوئے سبق کو سن کر خود راہ راست پر آنا تو درکنار، ان کی اُلٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے نہ سننے پائے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہیں[۱]۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے اُن میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا[۲]، مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ یقین جانو کہ یہاں اجارہ

(بقیہ سابق) [۲] یعنی ان کے مطابق عمل کیا ہوتا، جو ہدایات ان میں دی گئی تھیں اُن پر راست بازی کے ساتھ چلے ہوتے ان کو فی الواقع اپنی زندگی کا دستور بنایا ہوتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائیبل کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنفین نے بطور خود لکھی ہیں۔ اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دراندازی سے اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غلطی سے یہ دوسری قسم کی عبارات بھی محفوظ نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور اسی طریق زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس یہ حقیقت ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رَو گروہ پاتے اور انھیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی اور اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کر لینے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ وہ اُسی راستہ کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آرہے تھے، آپ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔

[۲] یعنی یہ بات سن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آکر اور زیادہ شدید مخالفت شروع کر دیں گے۔

کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔[1]

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے، مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفسانی کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو انھوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے انھیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ ان کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا۔ اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راستباز عورت تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں۔[2]

---

[1] دیکھو سورۂ بقرہ رکوع ۸۔

[2] ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا تو ان علامات سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان سے کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمھارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا اللہ ہے ؟ کہو، اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے۔[۱] ع ۱۰

(بقیہ سابق) بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا جس کا شجرہ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود سے محدود، اُن تمام قیود سے مقید اور اُن تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا حتیٰ کہ جسے شیطان کے ذریعہ سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا تھا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک وسہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور اس کے باوجود اسے خدائی سے متصف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالم واقعہ میں ظاہر ہوا تھا بلکہ انھوں نے خود اپنے وہم وگمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اشارہ ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور طریقے اخذ کیے، خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراط مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے، اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہیں رہا۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" (JESUS CHRIST) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی" (متی ۱۶، ۲۲) لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ "خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لوقا ۲۴، ۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگرچہ "مرقس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ "خداوند" (LORD) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں، بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں، جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے۔ مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا گناہ یا کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔"

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

"یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳، ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر "ابن آدم" کے نام سے کرتا ہے ...... یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا، اور اس کے دوسرے ہمعصر بھی جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو "مسیح" سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً

(باقی اگلے صفحہ پر)

"بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے ...... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اِس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا، البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔"

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

"عیدِ پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہمعصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے ...... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشو و نما کے مدارج سے گذرا، اس کو بھوک و پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ...... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گذریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گذرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی" اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات قطعاً خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ سابق) کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانہ سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے :

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا . . . . . یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہکر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال تھا جس نے مسیح کے لیے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل متقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند یہوہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا، اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" (CHRISTIANITY) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ کر یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے، مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح

(بقیہ سابق) اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔"

اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا (CHURCH HISTORY) کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلما اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزء لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح

(باقی اگلے صفحہ پر)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤد اور عیسیٰ ابنِ مریم کی زبان سے

(بقیہ سابق) کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۵۵۳ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ شخصیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف شخصیتوں کا حامل ہے۔ . . . .

اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل و کرم کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخر کار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں . . . . یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرلے، اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استقرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے، اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے"۔

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اُس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گذشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔

لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، [سلے] بُرا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔ آج تم اُن میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہلِ ایمان کے مقابلہ میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت بُرا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے اُن کے لیے کی ہے، اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہلِ ایمان کے مقابلہ میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے [سلے]، مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں کہ "پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

[سلے] ہر قوم کا بگاڑ ابتداءً چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام ان بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیتِ مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملہ میں تساہل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انھیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

[سلے] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انھیں فطرۃً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں، مگر بہرحال انہی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہوں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرینِ نبوت کے ساتھ ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" اُن کے اِس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنّتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انھیں جھٹلایا، تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو[سلہ] اور

(بقیہ سابق) اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ خود حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو قانونِ الٰہی کے بجائے قانونِ نفس کے پیرو قرار پاؤ گے۔ دوسری بات یہ کہ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، بودھ مذہب کے بھکشوؤں اور اشراقی متصوفین کی طرح رہبانیت اور قطع لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنا اور دنیا کے سامانِ زیست سے تعلق توڑنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ صحابۂ کرام میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جن کے اندر یہ ذہنیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض صحابیوں نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے، راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے، گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے، عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تمھارے نفس کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ مجھے دیکھو، میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی۔ پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" پھر فرمایا "یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو

(باقی اگلے صفحہ پر)

حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو حلال طیب رزق اللہ نے دیا ہے اُسے کھاؤ پیو اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم جو مہمل قسمیں کھاتے ہو ان پر اللہ مواخذہ نہیں کرتا مگر جو قسمیں جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرتا ہے۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔

(بقیہ سابق) اور خوشبو اور نیند اور دنیا کی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ میں نے تو تمھیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و خلوت نشینی۔ ضبطِ نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے۔ رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے اوپر سختی کی، اور جب انھوں نے خود اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی اُن پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں"۔ اسی سلسلے میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں تو آپ نے بلا کر ان کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا میں روزے سے ہوں۔ آپ نے فرمایا روزہ توڑ دو اور جاؤ۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ "حد سے تجاوز کرنا" وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کے حدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔ اللہ کو یہ تینوں باتیں ناپسند ہیں۔

سلہ چونکہ بعض لوگوں نے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسم کھالی تھی اس لیے (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو [۱]۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمھارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

اے ایمان لانے والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے [۲]، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے [۳]۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔

(بقیہ سابق) اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ میں قسم کا حکم بھی بیان فرمادیا کہ اگر کسی شخص کی زبان سے بلا ارادہ قسم کا لفظ نکل گیا ہو تو اس کی پابندی کرنے کی ویسے ہی ضرورت نہیں، کیونکہ ایسی قسم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اور اگر جان بوجھ کر کسی نے قسم کھائی ہے تو وہ اسے توڑ دے اور کفارہ ادا کرے، کیونکہ جس نے کسی معصیت کی قسم کھائی ہو اسے اپنی قسم پر قائم نہ رہنا چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] قسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں: ایک یہ کہ قسم کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے، فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے، ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے۔ تیسرے یہ کہ جب کسی صحیح معاملہ میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

[۲] آستانوں اور پانسوں کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ مائدہ رکوع ۱۔

[۳] اس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں۔ ایک شراب۔ دوسرے قمار بازی۔ تیسرے وہ مقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا خدا کے سوا کسی اور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔ چوتھے پانسے۔

شراب کی حرمت کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ ہر وہ چیز جو نشہ پیدا کرے اسی حکم میں داخل ہے جو شراب کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ نیز یہ کہ جس چیز کی کثرت مقدار نشہ پیدا کرتی ہے اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ اگرچہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی بشرطیکہ وہ آئندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رُکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں، اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ع ۱۲

اے ایمان لانے والو! اللہ تمھیں اُس شکار کے ذریعہ سے سخت آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے، پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گذرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اس گناہ کے کفارہ میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے[۵] ، تاکہ وہ اپنے کیے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) شراب کے ایک قطرے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم امتناعی کی پابندی کرنے کے لیے آدمی کے قلب میں شراب کی طرف سے جو نفرت ہونی چاہیے وہ ایک قطرے کے استعمال سو بلکہ شراب آلودہ گلاس میں پانی پی لینے سے بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور اس سے حرام میں مبتلا ہونے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس لیے شراب کی کم سے کم مقدار بھی حرام ہے اگرچہ وہ بجائے خود نشہ آور نہ ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵؎ ان امور کا فیصلہ بھی دو عادل آدمی کریں گے کہ کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کتنے روزے رکھے جائیں۔

مقالات

اجتماعیت کی شیرازہ بندی

افاداتِ سورۂ حجرات

(از جناب ڈاکٹر عبدالقوی لقمان صاحب، لاہور)

عالمِ انسانیت کے حالیہ مصائب مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک جہاں کہیں انسانی نسل آباد ہے، آج ہر طرف بے چینی، اضطراب، مصیبت، تباہی و بربادی اور تزلزل و انتشار کے عجیب وحشتناک اور پُرالم مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دنیا ایسے دورِ انقلاب سے گذر رہی ہے جس میں کئی انقلابی محرکات اُلجھ کر گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کا سارا نظامِ حیات زیر و زبر ہو کر کسی نئے نقشہ پر مرتب ہونے والا ہے اور پرانے نظام کی بوسیدگی و فرسودگی سے اُکتا کر منتظمانِ قضا و قدر یہ پکار اُٹھے ہیں:۔

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

انقلاب کی بدترین ہولناکی اُن ممالک میں برپا ہے جہاں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یورپ کے تمدن زاروں پر نگاہ کیجیے کہ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ آبادیاں ویران ہیں، اور ویرانے محشرستان۔ سر بفلک محلات آتش زدگی اور بربادی کی ہولناک داستان سنانے کے لیے اپنا انجر پنجر آسمان کو دکھا رہے ہیں۔ سر سبز جنگل اور زرخیز زرعی میدان جلے بجھے کوئلوں کے ڈھیر اور بے ترتیب خس و خاشاک کے انباروں سے۔ اٹے پڑے ہیں۔ آہ! کیا تقدیر امم کا مفسر وَجَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ کی واقعی تفسیر سمجھا رہا ہے؟

جس سائنس کی ترقی نے انسان کو مہذب و متمدن بنانے میں کئی صدیوں کی مسلسل محنت سے ارتقائی الفلاح حال پیدا کرنے میں مذہب و اخلاق کے روحانی نظام کا ہاتھ بٹایا تھا، اب وہی سائنس انقلاب کے فرشتوں کے لیے ایسے ایسے ہلاکت آفریں اسلحہ تیار کر رہا ہے اور بربادی کے ایسے بھیانک مناظر آنکھوں کے سامنے لا رہا ہے کہ الامان والحفیظ۔ نہ کسی آنکھ نے اس سے پہلے تباہی کا ایسا سماں دیکھا، نہ کسی کان نے ایسے مہالک سنے اور نہ کسی ذہن نے ان کا تصور باندھا۔ جن ممالک میں جنگ کا دیو دندناتا پھر رہا ہے اُن کی دکھ بھری داستان سے تصور تک کی روح لرزتی ہے۔ باقی دنیا پر مسموم دھوئیں کے بادل، دبی دبی آگ کی چنگلی کھا رہے ہیں اور رُبع مسکون کا کوئی حلقہ ایسا نہیں ہے جہاں انقلاب کسی نہ کسی عنوان سے اپنے دانت نہ تیز کر رہا ہو۔ ہمارے وطن کے کئی دروازوں پر جنگ کی دستک سنائی دے رہی ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر انقلاب آفریں خود غرضی اور نفرت و کدورت کے وہ عناصر ہیں جو اندر ہی اندر کئی طبقات میں آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح کھول رہے ہیں اور کسی آن دنیا کو لرزا دینا ہی چاہتے ہیں۔

ان حالات میں یہ قدرتی امر ہے کہ ہر شخص سوچے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ارباب سیاست اپنی اُدھیڑبُن میں ہیں، فوجی اور عسکری جماعتیں اپنی کھچڑی پکا رہی ہیں، عوام ہراسانی و سراسیمگی کی متحرک فضا دیر بن رہے ہیں۔ سرمایہ دار لوگوں کا عشق زر ہر پابنی بخار کی انتہا کے آثار کا آئینہ دار ہے اور طرح طرح کے تشنج کے دَوروں کی شکل اختیار کر رہا ہے: کہیں وہ جونکیں بن کر غریبوں کا خون تک چوس جانے کا جتن کر رہے ہیں، اور کہیں سرمائے کو سونے چاندی میں بدل کر دفن کرنا چاہتے ہیں۔ کوتاہ اندیش تجارت پیشہ لوگ اپنی پونجی کو اس طرح چھپانا چاہتے ہیں کہ ہر عمومی مصیبت ان کے لیے منفعت کی کلید بن جائے۔ کچھ لوگ اناج اور ضروریات زندگی کو چوہوں کی طرح اپنے انفرادی بلوں میں ذخیرہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس تدبیر سے انقلاب کی رَو رُک نہ گئی تو وہی شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں دبا کر اس کے اثر سے بچ جائیں گے۔ لیکن کسی کو بھی اپنی تدبیر دل پر راحت ضمیر حاصل نہیں۔ کیونکہ ہر ہر جتن کے ساتھ حدشات وابستہ ہیں۔ ممکن ہے ابھی سونے چاندی کے ڈھیروں کے عوض جوان جان

جو کھوں سے سمیٹے جا رہے ہیں، جانیں گنوانی پڑیں ممکن ہے پرانی دشمنیاں اور زیر دستوں کے ساتھ زیادتیاں اجل کا پیام بن کر بد امنی میں سامنے آموجود ہوں۔ بُرے وقت میں تو ایک ایک روٹی اور گھونٹ بھر پانی کے لیے لوگ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ تو کیا خوراک کے ذخیرے بھوکوں کو حملے کی دعوت نہ دیں گے؟ یا سونے چاندی کے دفینے لٹیروں کو موت و عذاب کے فرشتے نہ بنا ڈالیں گے؟

ہمہ گیر مصیبت کے اسباب اس بہ بختی کا علاج یا اس نحوست کا دفعیہ ہم جبھی کر سکتے ہیں کہ اس کے اسباب پر ہماری نظر ہو۔ مرض کے سبب کی قطعی تشخیص ہی تیر بہدف علاج کی طرف راہ نمائی کر سکتی ہے، ورنہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے سے علاج شفا بخش نہ ہو سکے گا۔ آئیے! دنیا بھر میں نظامِ حیات کے تزلزل کے حقیقی اسباب اور سماج کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دینے والے روگ کی اصلی کُنہ کا کھوج لگانے کی کوشش کریں۔

اجتماعی زندگی میں انسانی مزاج کے دو سانچے پائے جاتے ہیں یا دو قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

(۱) انفرادی، خود پسندانہ یا خود غرضانہ۔ (۲) نوعی، اجتماعی یا سماجی۔

(۱) انفرادی میلانِ فکر یا ذہنیت یہ ہے کہ ہر بات میں، ہر موقع ہر اقدام سے پہلے فرد کو اپنی تسکین، اپنی راحت، اپنے بقاء، آسائش اور سہولت کا خیال مقدم ہو۔ جب تک اپنی ضرورت پوری نہ ہو چکے نوع، جماعت یا اجتماعیت کی ضرورتوں کا خیال ہی نہ آسکے۔ ہر نفع میں اپنے لیے اوّلیت مقصود ہو اور جب کوئی تکلیف یا مصیبت آپڑے یا کسی آزمائش سے سابقہ پڑ جائے تو اسے اپنی ذات سے دوسروں پر ٹالا جائے۔ اس میلانِ فکر کو خود غرضی، انانیت یا نفسانیت (SELFISHNESS) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کے خواص یہ ہیں کہ مال و املاک اور آسائش و معیشت کے اسباب سے محبت ہوتی ہے، اس کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ ہوتی ہے، اور جتنا مال و اسباب بڑھتا ہے اسی قدر اس کی طلب تیز ہوتی ہے اور ہمیشہ "ھل من مزید" ہی کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اسبابِ معیشت کی فراوانی اور طاقت کی افزائش کا گھمنڈ پیدا ہوتا ہے جو اپنی نمائش بھی چاہتا ہے اور داد بھی۔ معیارِ زندگی بلند ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں تعصب دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے، یعنی اپنی

اپنی مملوکات، صفات اور زندگی کے طور طریقوں کی ستائش کی طلب ہوتی ہے اور کم نصیب یا محروم القسمت لوگوں کو گھٹیا اور ہیچ خیال کیا جاتا ہے۔ ہر اقدام کے لیے داعیہ فقط اپنی خواہش ہوتی ہے اور مقصد براری کی راہ میں کوئی نظام اخلاق یا اجتماعی تخیل روک نہیں ہوتا بلکہ طاقت اور بربادی و ہلاکت کے ہتھیاروں سے اپنی بات منوائی جاتی ہے اور اگر دلیل پیش کی جاتی ہے تو گھونسے، تلوار، بم اور توپ۔ دل میں کسی نظام عدل کے احترام کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۲) اجتماعی اندازِ فکر یا میلانِ طبع کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ نوع، جماعت، سماج یا اجتماعیت کی بقا ار فراد پر مقدم ہو۔ اجتماعی منفعت اور نوعی بقا کو مقصودِ اصلی قرار دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو اجتماعیت کی بقا اور سربلندی کی خاطر افراد کی آسائش اور ضروریات ہی کو نہیں، ان کے وجود کو بھی قربان کر دیا جائے۔ اس اندازِ فکر سے نوع پروری، ہمدردی اور اخوت کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ انفرادی تقاضوں میں قناعت اور سیر چشمی پیدا ہوتی ہے۔ مصیبت کو صبر و شکیبائی سے جھیلنے کی عادت بنتی ہے۔ اجتماعیت کی خاطر انفرادی ضرورتوں اور طبعی تقاضوں کی تسکین سے باز رہنے میں لذت اور قلبی سرور حاصل ہوتا ہے اور نوع کی خاطر جان دے ڈالنا اور مال و املاک قربان کر دینا آسان ہی نہیں دل پسند بھی ہوتا ہے۔ اس ذہنیت کا انسان سچائی اور حق کی طاقت سے سہارا ڈھونڈتا ہے۔ دل قدرت کے قائم کردہ نظام عدل کے یقین و احترام سے معمور ہوتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں دلیل اور برہان سے دوسروں کے دل اور دماغ کو اپیل کرتا ہے اور بجز دفاعی مجبوری کے تلوار نہیں اٹھاتا۔

نتیجہ کے اعتبار سے انفرادی اندازِ فکر تخریبی اور فساد انگیز ہے اور اجتماعی ذہنیت تعمیری اور امن پرور دنیا کی زندگی میں انسان اجتماعی زندگی پر تو مجبور ہے۔ لیکن اس بارے میں اسے کامل اختیار ہے کہ اپنا مزاج خود غرضانہ رکھے یا اس کے دل میں نوع پروری بسی ہو۔ اسی اختلافِ طبیعت پر تعمیری اور تخریبی کشمکش جاری رہتی ہے۔ خود غرض لوگ اپنے جیسے غرض کے دیوانے ایک ٹولی میں جمع کر لیتے ہیں اور بڑے پیمانے پر غرض

پرستی کی کلیں گھمانا شروع کر دیتے ہیں۔

فطرت کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل کا ایک جواب ہوتا ہے جسے اس کا ردِ عمل، ردِ فعل یا ری ایکشن (REACTION) کہتے ہیں جس کی کیفیت اصل عمل سے متضاد ہوتی ہے۔ خود غرضی، انانیت، نفسانیت یا انفرادی انداز فکر لازماً ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔ جو دوسرے کی روٹی چھین کر اپنا پیٹ بھرے گا، دوسرے اس کی روٹی چھیننے کا جتن کریں گے۔ اور جو دوسرے کی مصیبت کے لیے اپنے کو ڈھال بنائے گا دوسرے بھی اس کے لیے جان چھڑکنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ اس قانونِ فطرت کا اثر یہ ہے کہ انفرادی اندازِ فکر سے فرد اپنے گرد و پیش مخالفانہ ردِ عمل پیدا کر کے انجام کار اپنے آپ کو دشمنی کے ماحول میں بے یار و مددگار پاتا ہے۔ اجتماعی اندازِ فکر سے بالآخر فرد محفوظ اور منفعت کے ماحول میں پہنچ جاتا ہے جو اس کی اپنی نوع پرورانہ مساعی کے دوسرے لوگوں کے دلوں پر ردِ عمل کا ثمرہ ہوتا ہے۔ فطرت ہر آویزش اور کشمکش میں آخری فتح اسی کو دیتی ہے جو نوع کے لیے نفع رساں ہو[1] اور فساد اور تخریب کی طاقتیں وقتی اور عارضی جیت یا سنبھالوں کے باوجود انجام کار خسارے گھاٹے اُتار دی جاتی ہیں۔

دنیا کے عمومی اضطراب اور مصائب کی تہ میں یہی غرض پرستی کے عناصر کام کر رہے ہیں۔ ایک طویل مدت سے یہ سلسلہ چل رہا ہے کہ بعض انسانی گروہوں نے دولت اور سروسامانِ معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے چنڈال چوکڑیاں بنا رکھی ہیں، اور ٹھگوں، اٹھائی گیروں اور ڈاکوؤں کی ٹولیوں کی طرح اپنے جتھوں کو اس لیے مسلح کر رکھا ہے کہ دوسروں کو لوٹ لوٹ کر اپنی ملکیت کے انبار لگائے جائیں۔ اسی خود غرضی نے کئی بھیس بدلے اور کئی بہروپ بھرے۔ لیکن ہر رنگ میں فطرت کے قوانین نے اس کا جواب دیا۔ اسی دورِ تاریخ میں کئی قسم کی

---

[1] وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔ جو چیز انسانوں کے نفع کی ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے۔ (رعد)۔ یہاں قدرت کا یہ اصول وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کائنات کے کارخانہ میں بقاء انفع کا اصول کارفرما ہے۔ بے کار ردی چیز فنا کر دی جاتی ہے اور نفع رساں مفید عام چیزوں کے لیے بقاء اور قیام مقدر ہے۔

منظم جماعتوں کے درمیان فیصلہ کن طاقت آزمائی ہو رہی ہے۔ اور قوانین قدرت اپنا کام کر رہے ہیں۔ کوتاہ نظر اور عاقبت نااندیش قوموں نے اپنی منفعت کی خاطر دوسروں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ اور فاسد جماعتیں اور اغراض، باہم ٹکرا کر لڑ مر رہی ہیں۔ جب تک غرض پرستی کا کیش غالب ہے ایک عالمگیر جنگ کے بعد دوسری عالمگیر جنگ برپا ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ فطرت کا ہاتھ فساد و تخریب کے عناصر کو چن چن کر مغلوب اور فنا کر دے۔

علاج اس عمومی ہلاکت اور مصیبت کا علاج یہی ہے کہ انسانوں کو ایسی اجتماعیت کے شیرازے میں باندھا جائے جو فطرت کے منشاء اور قوانین کے مطابق ہو۔ جس کی بنیاد نوع پروری پر ہو۔ جو ساری انسانی آبادی کے لیے رحمت کا پیغام رکھتی ہو اور جو ایسے نقشے پر منظم کی جائے جس پر نظام کائنات[1] خود قائم ہے۔ اور اس کی زندگی کی ضامن وہی روح ہو جو کارخانۂ حیات کے ہر ہر پرزے میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہ اجتماعیت دنیا میں ایسا نظام حیات نافذ کرے جس کے تحت ساری انسانی آبادی سکھ اور راحت ضمیر کی زندگی گذار سکے۔ کسی گروہ کی خود غرضانہ آمریت کسی دوسرے گروہ کو ذلیل اور مظلوم و مقہور بنا کر نہ رکھ سکے۔ ہر فرد کا طرز زندگی نوع پرورانہ اور اجتماعی ہو اور اجتماعیت ہر فرد کی جسمانی و روحانی ضرورتوں اور تقاضوں کی کماحقہٗ تسکین کی کفیل ہو۔

---

[1] سرگروہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اللہ نے بیان فرما دیا وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی آپ کو بھیجنے کا مقصد بجز اس کے کوئی نہیں کہ آپ کا وجود اور آپ کا نظام دنیا جہان کے لیے رحمت ہی رحمت ثابت ہو۔ اسی عنوان کی روشنی میں اس آیت کریمہ کے مضمون پر بھی غور کیجیے۔ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (وہ وہی ذات ہے جس نے اپنے پیغامبر کو اس غرض سے بھیجا ہدایت کے ساتھ اور مبنی برحق نظام دے کر تاکہ اس کے نظامِ حق کو تمام مروجہ نظاموں پر غالب کر دے اگرچہ ایسا ہونا مشرکوں کو گوارا نہ ہو۔

آیئے اب ذرا جماعت بندی اور اس کی تنظیم و تشکیل کے متنوع اور بوقلموں نقشوں یا مروجہ ادیان کا جائزہ لے کر دیکھیں اور اُن کے حسن و قبح کا موازنہ کریں تاکہ صالح ترین اجتماعی نظام یعنی دینِ حق کا سراغ مل سکے۔

اپنے غارِ تنہائی کے زاویے یا خلوت کے حجرے سے نکل کر جب انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا شروع کرتا ہے تو اس پر اجتماعی زندگی کے اسرار و رموز کھلنے شروع ہوتے ہیں اور طرح طرح کے اجتماعی تجربے ہونے لگتے ہیں۔ کامیابی اور فوز مرام کا سہرا انہی لوگوں کے سر بندھتا ہے جو مضبوط جماعت اور بڑا جتھا بنا کر اس کا شیرازہ مستحکم کر لیتے ہیں۔ اجتماعی ٹکراؤ اور تزاحم میں بہتر انسانی تنظیم کمتر تنظیم پر غالب آتی ہے اور فتح و نصرت اُسی کے قدم چومتی ہے جس کی جماعت بہتر ہوتی ہے۔ ایسی کامیاب اور صالح اجتماعیت میں تمام افرادِ نظام کے شیرازے میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے بھنچی ہوئی مٹھی میں ہاتھ کی انگلیاں اور تمام افراد باہم دگر متحد ہو کر خوش حالی اور مصیبت میں، بھلے اور بُرے میں، سرد اور گرم میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ سارے جتھے کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے، ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ۔ ہر فرد کے دل کی ایک ہی لگن ہوتی ہے اور سب کے حال کی ایک ہی کیفیت۔ اگر فتح ہے تو سب ہی کی اور شکست ہے تو سب کی جماعت کا ہر ہر فرد اپنی بساط اور مقدور کے مطابق اپنے مال و جان کو جماعت کے مشترک مفاد پر چھڑک دیتا ہے، بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اور اگر جماعت کے مقصد کی راہ میں موت آجائے تو فنا کا جام اس مزے سے چڑھا جاتا ہے گویا اسی کی پیاس میں منزلیں مارتا چلا آرہا تھا۔

غور کیجیے کہ جتھے اور افراد میں کیا تعلق ہوتا ہے جو انھیں اس مضبوطی کے ساتھ باہم پیوست کر دیتا ہے؟ اور کونسا داعیہ ہے جو ہر فرد کے دل میں اجتماعیت کی لگن لگا دیتا ہے؟ دنیا کی اجتماعیتوں کا امتحان کرنے سے آپ کو مندرجہ ذیل رشتے ایسے نظر آئیں گے جن کی بنیادوں پر اجتماعیت کی عمارت چُنی جاتی ہے۔ بعض اجتماعیتوں میں فقط ایک ہی تعلق ربط و ضبط کا ذمہ دار ہوتا ہے اور بعض میں ایک سے زیادہ۔ جتنے زیادہ تعلقات درجہ ارتباط ہوں گے اسی قدر اجتماعیت مضبوط ہوگی اور گردشِ روزگار کے مقابلہ میں اپنے شیرازہ کو سنبھالے رکھے گی

(۱) انسانی نسل کا رشتہ جس طرح جانوروں میں فطری طور پر باہم رہنے کا طبعی تقاضا ہوتا ہے، جنگل میں ہرنوں کے گلّے الگ چرتے ہیں، نیل گائیں اپنے گلوں میں گردش کرتی ہیں، مرغابیاں، تلیئر، مکڑی، چیونٹی، شہد کی مکھی وغیرہ سب فطرت کی وجدانی رہنمائی سے اجتماعی زندگی گذارتی ہیں جو حیاۃ الحیوان کا ایک بڑا دلچسپ پہلو ہے، اسی طرح انسان میں بھی یہ وجدان بدرجۂ کمال موجود ہے اور اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

لیکن انسانی آبادی کچھ بہت بڑھ جانے پر سب انسانوں کا ایک ہی جماعت میں جمع رہنا ممکن نہ رہا۔ قدرتی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک ہی نقشے پر انسانوں کی کئی جمعیتیں دنیا کے مختلف اقطاع میں آباد ہو جاتیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ کئی جمعیتیں بنیں اور ہر جمعیت میں وجہِ اشتراک جدا ہوئی، اور مختلف جمعیتوں میں کچھ اسباب نزاع و اختلاف پیدا ہو گئے اور انسانی نسل بٹتی اور تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی۔ لیکن بہرحال اس کا فطری وجدان اس رشتہ سے بیگانہ نہیں ہوا۔ نسل انسانی کی ذیلی اجتماعیتوں کے اشتراک کا باعث محدود قسم کے اسباب بنے۔

(۲) نسلی اور قومی شجروں پر مبنی جماعتیں۔ مثلاً آریائی، سامی، منگولین وغیرہ اپنے وطنوں سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچیں تو اپنی نسلی جمعیت کو ان ممالک کے بسنے والوں سے ممتاز رکھا۔

(۳) وطنی اور جغرافی اجتماعیتیں، چینی، ہندی، یورپی، انگریزی، امریکی وغیرہ قدرتی طور پر یکجا ہونے کے باعث منظم زندگی گذارنے لگیں۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب نسلی اجنبیت اُنس میں بدل چکے۔

(۴) لسانی و تمدنی، جنہیں وجہِ اشتراک زبان اور تمدن ہوا اور پھر اجتماعیت کا پورا نقشہ بن کر تیار ہو گیا۔ ایک زبان بولنے والوں اور مشترک تمدن پر زندگی گذارنے والوں کے لیے باہم آمیزی مختلف اللسان اور بود و باند کے مختلف معیار والے لوگوں کی نسبت آسان ہے۔ اور اسی لیے یہ ایک بڑا مضبوط ذریعہ ارتباط ہے۔

مذکورۂ بالا گروہ بندیاں اگر اجتماعی ذہنیت پر بنیں، یعنی دوسری اجتماعیتوں سے تعاون اور اشتراک مقصود ہو نہ کہ رقابت اور خصومت تو ان پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ ان کی بنیادی ذہنیت غرض پرستانہ ہوتی ہے۔ ہر جماعت اپنی فضیلت کا ڈنکا بجاتی ہے اور دوسروں کو اپنے سے کمتر اور ہیچ ظاہر کرتی ہے اور اس ذہنیت

کے تحت قومی اور جماعتی تعصب کی جڑیں اتنی دور تک دھنسی ہوتی ہیں کہ غرض پرستانہ مقاصد کی انگیخت پر دوسری جماعتوں سے جنگ وجدل اور دنگا فساد چلتا رہتا ہے جس کے قصوں سے تاریخ کے اوراق جابجا داغدار نظر آتے ہیں۔

(۵) بہیمی اور مادی طاقت کی آمریت پر مبنی گروہ بندی۔ بعض گروہ اور ٹولے اس طرح بھی منظم ہو جاتے ہیں کہ طاقت اور بہیمی کس بل کے بل بوتے پر، لوگوں میں خوف اور ہراس پھیلا کر زیردستوں کو دہشت زدہ بنا کر لوٹ مار کی جماعت بنالی۔ دل کے کمزور لوگ اپنی عافیت کی خیر منانے کے لیے ایسے ٹولے اور اس کے لیڈر کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور بے چون وچرا اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ نہ کریں تو جان ومال سے جائیں۔ چوروں، ڈاکوؤں، ٹھگوں اور اٹھائی گیروں کی ٹولیاں، "انڈر ورلڈ گینگز" اسی انداز پر مبنی ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کی تاریخ میں ایسے ٹولوں کا بڑا دور دورہ رہ چکا ہے۔ افغانستان کے بچہ سقہ اور اس کے گروہ کا عروج اور زوال عہد حاضر کی تاریخ کا تازہ واقعہ ہے۔ اور سندھ کے حروں کے قصے آپ روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ ایسے ٹولوں کا فلسفہ حیات "جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس" ہے۔ ان کے افراد کے درمیان تعلق میل اور جوڑ کا نہیں ہوتا بلکہ انتہائی نفسانیت اور غرضمندی کے ساتھ، لیڈر اور جماعتی نظام سے خوفزدگی اور باہمی تنافر وخدشہ کا۔ جس طرح بھاپ کی طاقت اس کے ذرّوں کے انتشار اور ایک دوسرے کو دور دھکیلنے پر موقوف ہوتی ہے۔ بھاپ کو بھی جب تک [illegible] کسی رخ پر لگائے رکھیں اس کی طاقت انتشار سے بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں، لیکن اگر رکاؤ اور تعطل ہو تو بائلر تک کے ٹکڑے دھماکے سے اُڑ جاتے ہیں۔ بہیمی طاقت کی آمریتیں بھی اسی نہج پر زندگی گزارتی ہیں اور اسی انداز پر انکا شیرازہ فنا ہو جاتا ہے۔

آمریتیں ضروری نہیں کہ اپنی طرز زندگی میں ایسی ہوں کہ ان کی حقیقت کو ہر کوئی برہنہ دیکھ سکے۔ اکثر اوقات تو فریب نظر کے لیے اُن پر بڑے خوشنما لبادے لپٹے ہوتے ہیں جن کے نقش ونگار میں اُلجھ کر لوگ حقیقت کی تحقیق کی جرأت ہی نہیں کرتے۔

(۶) سرمایہ داری نظام کی آمریت معاشی اقتدار کے بل پر قائم ہوتی ہے۔ چند زر پرست سرمایہ دار اس کے مالک ہوتے ہیں اور وہ اپنی اغراض برآری کے لیے مکڑی کے جال کی طرح اجتماعی نظام پھیلا لیتے ہیں۔ لیکن بہرحال جو آمریت اور ڈکٹیٹرشپ بھی اجتماعی اور نوع پرورانہ اندازِ فکر پر مبنی ہو اور فطرت کے صالح قوانین پر عامل نہ ہو وہ فاسد اور زوالی ہے۔ نمائش اور پراپاگنڈا سے کچھ وقت نکل سکتا ہے لیکن نتیجہ اور انجام حقیقت پر موقوف ہے۔ سرمایہ داری نظام کی نوع کشی ڈاکوؤں اور رہزنوں کی قتل و غارت سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوئی ہے۔

(۷) اشتراکِ مفاد پر مبنی جماعتیں بھی اجتماعیت کی اہم قسم ہیں۔ مثلاً بیوپار منڈل، کسان سبھا، لیبر یونین، اور اسی طرح بھوکوں کی جماعت اور بیکاروں کی جماعت وغیرہ۔ بیروں کے ڈھیر کی طرح اُن کے شیرازے کو بکھیرنا، گردشِ لیل و نہار کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ جب بھوکے کو روٹی مل گئی وہ جماعت سے کٹا، جس بے کار کی نوکری کا سامان ہو گیا وہ ان سے چھوٹا۔ بیوپاریوں کا مشترک خطرہ ختم ہوا تو اُن کے متحدہ محاذ کے ساتھ ہی بھنڈار کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹا اور آپس کی مقابلہ بازی شروع ہو گئی۔ ایسی جماعتیں اسی وقت تک گٹھے کی طرح بندھی رہتی ہیں جب تک مشترک مصیبت کی رسّی انھیں کس کر باندھے رکھے۔ جب جماعتی مصیبت ختم ہوئی تو جتنے جتنے کی لاکڑی جدا ہوئی۔

ایسی جماعتیں اگرچہ عارضی مدت کے لیے اندرونی طور پر نوع پرورانہ دعاوی رکھتی ہیں لیکن اپنی جماعت سے باہر باقی سب سے مقابلہ بازی اور مخالفت مقصود ہوتی ہے اور بس چلے تو دوسروں کے حقوق غصب کر کے بدترین قسم کی نوع کشی پر اُتر آتی ہیں۔ بیوپاریوں کا زائد منافع کی خاطر، ضروریاتِ زندگی کو دبا کر عوام کو فقر و فاقہ میں مبتلا رکھنا کس درجہ شقاوتِ قلبی ہے؟ یہ اسی فاسد جماعت بندی کا کھیل ہے۔

(۸) طبقاتی گروہ بندیاں:۔ دولت مند اور سرمایہ دار لوگ ایک بلند معیارِ زندگی بنا لیتے ہیں جسے شرافت اور نجابت (Nobility and Aristocracy) کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ بڑی عیش و عشرت (رفاہیتِ بالغہ) کی زندگی بسر کرتے ہیں، اپنے ہم پلہ لوگوں سے ہی سماجی تعلق رکھتے ہیں اور باقی سب کو نیچ

اور اچھوت بنا ڈالتے ہیں۔ دوسرے لوگ مجبور ہو کر اپنی سوشل زندگی کی پیاس بجھانے کے لیے جدا حلقے، دائرے یا کلبیں بنا لیتے ہیں اور اس طرح متعدد مدارج دولت کے اعتبار سے متعدد سوشل طبقات (Economic classes) بن جاتے ہیں جن کے درمیان منافرت، حسد، رقابت اور دشمنی کی گہری کھائی اور عمیق خلیج حائل ہوتی ہے۔ یہ طبقاتی تقسیم انسانی اجتماعی زندگی کی بنیادوں میں بدترین گھن ہے۔ مروج مالی اور صنعتی نظام کے تحت یہ روگ لاعلاج ہے۔

(۹) وحدتِ خیال و افکار کی بنا پر۔ (الف) مذہبی رسوم و اعمال کی گروہ بندیاں یا (ب) سیاسی عقائد و عصبیت پر مبنی جماعتیں، بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

(الف) مذہب تو حقیقت میں خدا کا سکھایا ہوا پروگرام ہے جس پر چل کر انسان، روح اور جسم دونوں کے اعتبار سے کامیاب اور فائز المرام زندگی گذار سکتا ہے۔ وہ فطرت کے قوانین کا نچوڑ ہے اور نوع پروری کی جان ہے۔ وہ سچائی کا ایسا نظام ہے جو فاطر السموات والارض نے اپنے چنے ہوئے سچے اور امانت دار پیغامبروں کی معرفت دنیا کے کونے کونے میں پھیلا رکھا ہے اور جس کی بنیادی سچائیوں کو آپ ہر انسانی گروہ کی مقدس کتابوں میں صاف پہچان سکتے ہیں۔ اگرچہ بسا اوقات گدڑی کے لعل کی طرح جو میلے کچیلے چیتھڑوں اور کوڑے کرکٹ کے انباروں تلے دبا ہوا ہو وہ انسانوں کی اختراع کردہ گمراہیوں سے گھرا ہوتا ہے۔ اس عالمگیر سچائی کے نظام کو اللہ نے اسلام سے موسوم کیا ہے۔ (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) اور اس کے بغیر کوئی طرز زندگی اللہ کے ہاں مقبول نہیں (وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ....)۔ لیکن چند در چند وجوہ و اسباب سے جن کے تذکرے اور بحث کا یہ مقام نہیں، اس کی اصلیت اور حقیقت دنیا میں یوں بٹ گئی جس طرح شاعر کی داستان طائرانِ چمن میں ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہیں، کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

دنیا کے ہر ہر گوشے میں مذہبی سچائی تو موجود ہے لیکن اس کے ٹکڑوں کے گرد جنگل کی کائی، خودرو گھاس پھوس اور بیلوں وغیرہ کی باڑوں کی طرح چند خصوصی عقائد اور بعض رسوم و رواجات لپٹ گئے ہیں اور ان حشو و زوائد کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ باہر سے دیکھنے والوں کو عقائد اور ڈاگماز (Dogmas) ایسے معتقدات جنھیں کسی سوال یا چون و چرا کے بغیر تسلیم کر لینا لابدی ہوتا ہے، اس سے بحث نہیں کہ فہم و ادراک انھیں قبول کرے یا مہرے سے سمجھ میں نہ آئیں، ان سے انکار دھرم سے پتت ہونے کی دلیل ہے) اور خصوصی رسم رواج ہی پر اصل مذہب کا دھوکا ہونے لگا اور ایسے عقائد و رسوم کے ہر ملغوبے کو ایک جدا مذہب کا نام دے دیا گیا۔ دنیا میں جہاں عشق و محبت کے مضمون پر اور عام معاشرتی مسائل پر اتنے افسانے تصنیف ہو جاتے ہیں کہ دنیا کے کتاب خانے اپنی وسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ نظر آتے ہیں، مذہبی افسانے اور اصنامی داستانیں گھڑنے میں کیا مشکل ہے جبکہ اس پر زر و دولت اور شہرت و قبول عام کی للچاہٹ بھی اُکسا رہی ہو؟ بہرحال ایسے نظریات اور رسوم کے مجموعے جب مذہبی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں تو لوگ اُن کے لیے لڑنا اور مرنا اپنے ذمہ فرض ٹھیرا لیتے ہیں۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ سوچے اور سمجھنے کی کوشش کرے کہ کسی ایسے مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی اور کیوں چند خاص رسوم اپنائی گئیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ بڑوں سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور جو اس کا استخفاف کرے یا شک کا اظہار کرے اس سے لڑمرنا نیکی ہے۔ ہر ایک گروہ اسی طرح اپنے اپنے عقائد اور رسم و رواج کے حق میں یکساں متعصب ہوتا ہے۔ دلیل و برہان سے نہ ایک طرف کام چلتا ہے اور نہ دوسری طرف۔ اور دوسروں سے رواداری دھرم کا ایمان اور دینی بے حمیتی کے مترادف شمار ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مذہبی منافشے پیہم و متواتر چلتے ہیں اور اُن کی تلخی نئے نئے عنوانوں کے ساتھ اُبھرتی اور پھیلتی رہتی ہے۔

مذہبی جھگڑوں اور اس مقدس نام پر خوں ریزیوں کی داستان بڑی طویل ہے، اور آج بھی ہماری بے تدبیری اور بدفہمی کے سبب انسانی ترقی اور فلاح و بہبود کے بڑے بڑے کام اُلجھے پڑے ہیں۔ ہم مختلف مذہبی گروہوں کو پکارتے ہیں کہ آؤ اور باہمی جھگڑے نبٹا کر امن سے گذر کرنے کی تدبیر کرو۔ ہر گروہ اپنے آزمودہ کار

نمائندوں کو چن کر اس شرط کے ساتھ مصالحت کانفرنس میں بھیجتا ہے کہ وہ اپنے دعاوی اور رواجی خصوصیتوں میں کچھ نہ کچھ دوسروں سے منوا کر اور اپنے گروہ کے فائدے کی کوئی نہ کوئی چیز لے کر آئے گا۔ نہیں تو اسے لیڈری اور نمائندگی کے پُر افتخار منصب سے معزول کر دیا جائے گا۔ وہ جاتا ہے اور طلاقت لسانی اور فاش گوئی کی داد دے کر اپنے گروہ کے تماشائیوں کی واہ واہ کے نعروں کے درمیان کسی نامعقول بات کی پچ پر اڑ کر "واک آؤٹ" کر جاتا ہے۔ اور اس محفل کی فضا میں اپنی دھواں دھار تقریر کے ایسے مسموم اجزاء چھوڑ جاتا ہے جس سے دنیا کے کرۂ ہوائی میں زہریلے اجزاء گھٹنے کی بجائے اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مذہب انسانوں کو باہم ملاتا اور محبت کی زندگی گذارنا ہی سکھاتا ہے۔ باہمی مناقشات اور الگ الگ مذہبی گروہ بندی مذہب کے نام پر غرض پرست لوگوں کا لگایا ہوا دھبا ہے۔

(ب) سیاسی عقائد کی عصبیت پر تنظیم شدہ جماعتوں کی مثالوں میں اشتراکی (سوشلسٹ)، کمیونسٹ، اشتمالی، نیشنل سوشلسٹ (نازی)، فاشی وغیرہ ہیں جنہوں نے مضبوط اور با جبروت آمریتوں (ڈکٹیٹرشپس) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کا حسن و قبح بحث و تمحیص کی محفلوں کے علاوہ تاریخ عالم کی سب سے زیادہ ہلاکت بار جنگ کے میدان میں بھی آزمایا جا رہا ہے اور اس پر مستقبل قریب کی تاریخ قدرت کا فیصلہ سُن لے گی۔ یہ اجتماعی سیاسی عقائد ان خصوصی حالات اور اثرات کا نتیجہ یا ردعمل ہیں جو بنیادی طور پر غلط اور غیر فطری تھے۔ ان سے اکتائی اور دکھی ہوئی جماعتوں نے اپنے دکھوں کا مداوا اس میں ڈھونڈا ہے۔ اور یہ مداوا ابھی تجربہ و مشاہدہ کے آزمائشی دَور سے گذر رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان نظریات نے سماجی زندگی کے روگ کی جڑ کو درست کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی بلکہ مرض کی چند علامتوں کو سنوار کر اصلی روگ کو زیادہ مہلک بنا دیا اجتماعی زندگی کے جس قدر نئے نظام بنے ہیں ان سب کے تحت بھی زندگی کے سب فوائد ایک خاص طبقے اور جماعت کے لیے مخصوص ہیں۔ خواہ ان فوائد کے حصول کے لیے ساری دنیا کو برباد ہی کر دینا پڑے۔ اس طرح نوع پروری کے فوائد کو ایک محدود طبقہ میں محصور کر کے عمومی نوع کشی روا رکھنا ایسا اندازِ فکر اور ایسی

بنیادی گمراہی ہے جو ان جماعتوں کو بھی باقی نہیں رہنے دے گی۔

(۱۰) سچی اٹل اور امیٹ انسانی اجتماعیت وہی ہے جو انسانیت کی بنیادوں پر قائم کی جائے جس میں ہر جسم اور روح کے پتلے کو جسے انسان کہا جاتا ہے، جسمانی زیست کی ضرورتوں کی کفالت کی ضمانت دی جائے، اور راحت ضمیر کے ساتھ اس پر روحانی ترقی کی سب شاہ راہیں کھول دی جائیں۔ اس اجتماعیت میں شامل ہونے کے لیے نسلیت کا امتیاز نہ ہو، کوئی وطنیت یا قومیت وجہ ترجیح نہ ہو، کسی خاص زبان یا تمدن کی شرط نہ ہو، رنگ روپ اور جسمانی ڈیل ڈول کی کوئی قید نہ ہو اور کسی نام نہاد مذہبی اور رسمی گروہ بندی سے تعرض کیے بغیر سب آدم کے بیٹوں اور حوّا کی بیٹیوں کے لیے اس میں مساوی حیثیت سے شمولیت کے دروازے کھلے ہوں۔ اس اجتماعیت میں نوع پروری کی روح جاری وساری ہوگی۔ اس کی تنظیم کا نقشہ قوانین فطرت کے متوازی اور منشائے قدرت کے مطابق ہوگا، ہر فرد جماعت کا ایسا عضو یا پرزہ بنے گا جس کے لیے وہ جسمانی اور ذہنی طور پر موزوں ہو اور اس طرح سے اجتماعیت کے نظام میں لگا دیا جائے گا جس طرح مشین کا ہر کارآمد پرزہ لگا دیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ انسانوں کی جمعیت محض ایک مشین کے بے جان پرزوں کی آراستگی ہی نہیں بلکہ دل و دماغ رکھنے والی مخلوق کی تنظیم ہے، لہٰذا اس کے افراد کے دل و دماغ کے درمیان بھی کوئی ایسا رشتہ ہونا چاہیے جو دل و دماغ میں پیوست ہوسکے۔ یہ رشتہ محبت و الفت کا ہوگا چنانچہ اجتماعیت پر ایسا نظام الاخلاق حاوی ہوگا جو اس رشتے کی استواری کا ضامن ہو۔ محبت کا رشتہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں اور کوئی رشتہ اپنی گیرائی اور گرفت میں ٹھیر نہیں سکتا۔ بڑے بڑے مضبوط قلعے منہدم ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کی دیواروں کے پتھروں اور اینٹوں کے درمیان چونے اور سیمنٹ کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن دلوں کے رشتے جب محبت کی گرہ میں بندھ جاتے ہیں تو انھیں نہ توکدالیں جدا کر سکتی ہیں نہ پھاوڑے، نہ بارود اور ڈائنا مائٹ کے کارتوس ہی ایسی تعمیر منہدم کر سکتے ہیں، نہ آگئی بموں کی آگ سے دلوں میں الفت کے بندھن جل سکتے ہیں۔ محبت و الفت کا نسخہ تجربہ گاہ عالم میں

سینکڑوں بار دنیا کے ہر خطے میں اور تاریخ کے ہر دور میں آزمایا جا چکا ہے۔ ہر بار اس کا ایک ہی نتیجہ نکلا۔ یعنی ایک محبت کی بستی بس گئی، امن و آشتی کا دور دورہ ہو گیا۔ ہر جسم کو امن اور ہر ضمیر کو راحت کی نعمت میسر آئی اور انسانوں کی اجتماعیت نے ترقی اور رفعت کی وہ منزلیں طے کیں کہ ملائکہ ان کی گرد کو نہ پہنچ سکے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب انسانوں نے محبت کے رشتوں کو فراموش کر کے اجتماعیت کو انفرادی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیا تو اس کا نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی نکلا۔ انسانی برادری کی بستیاں برباد ہو گئیں، آبادیاں ویران ہو گئیں، اور جا بجا غوضمندی اور انانیت کے اُلّوؤں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ امن جان اور راحت ضمیر کی نعمتیں عنقا ہو گئیں اور انسانی درندوں کے کرتوتوں سے انسانی برادری کے بیشتر افراد تنزل کی ڈھلوانوں سے گرتے گرتے خونخوار درندوں اور رینگنے والے سانپوں اور بچھوؤں کو پستی کے مقابلہ میں پچھاڑتے چلے گئے۔

اس معیاری اجتماعی تنظیم کی تعلیم سورۂ حجرات میں دی گئی ہے جس کے افادات آئندہ اوراق میں ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔

معراج کا سفرنامہ

(ایک مقالہ جو ۲۷ رجب ۱۳۶۲ھ کو نشرگاہ لاہور سے نشر کیا گیا۔ (باجازت آل انڈیا ریڈیو)

معراج پیغمبر اسلام کی زندگی کے ان واقعات میں سے ہے جنھیں دنیا میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ۲۷ رجب کی رات کو پیش آیا۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ معراج کس غرض کے لیے ہوئی تھی اور خدا نے اپنے رسول کو بلا کر کیا ہدایات دی تھیں، حدیث یہ بتاتی ہے کہ معراج کس طرح ہوئی اور اس سفر میں کیا واقعات پیش آئے۔

اس واقعہ کی تفصیلات ۲۸ ہم عصر راویوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ جن میں سات راوی وہ ہیں جو خود معراج کے زمانہ میں موجود تھے اور ۲۱ وہ جنھوں نے بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زبان مبارک سے اس کا قصہ سنا۔ مختلف روایتیں قصہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور سب کو ملا نے سے ایک ایسا مفصل سفرنامہ بن جاتا ہے جس سے زیادہ دلچسپ، معنی خیز اور نظر افروز سفرنامہ انسانی لٹریچر کی پوری تاریخ میں نہیں ملتا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گذر چکے تھے ۵۲ برس کی عمر تھی، حرم کعبہ میں سو رہے تھے کہ جبریل فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں آپ کو زمزم کے پاس لے گئے، سینہ چاک کیا، زمزم کے پانی سے اس کو دھویا، پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی سواری کے لیے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ بجلی کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا، جبریل نے تھپکی دے کر کہا۔ دیکھ

کیا کرتا ہے۔ آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبریل آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اُتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریل نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طور سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا: ادھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبریل نے بتایا: یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی: ادھر آؤ۔ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریل نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریل نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریل نے کہا دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجیے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریل نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیا اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لیے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں پانی، دوسرے میں دودھ، تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریل نے مبارک باد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریل اس کے ذریعہ سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔ پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے؟ جبریل نے

اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمھارے ساتھ کون ہے؟ جبریل نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انھیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی اُن بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے، چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریل نے بتایا یہ آدم ہیں آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسل آدم ہے، آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور برے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔ پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انھیں نماز کے لیے اُٹھنے نہ دیتی تھی۔ کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا۔ یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اُٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔ پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔ ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس میں سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا، پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے پھر نادم ہو کر اس کی تلافی

کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔ ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبان طعن دراز کرتے تھے۔ انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔ کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔ پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں، آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گذرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔ پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے حرام سے اپنی خواہش نفس پوری کی۔ پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیے جو اُن کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔ آپ نے جبریل سے پوچھا، اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہرے کے ساتھ ملے، ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریل نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سن کر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلے سے گذر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں۔ تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا

حسن عام انسانوں کے مقابلہ میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔ چوتھے آسمان پر حضرت ادریس، پانچویں پر حضرت ہارون، چھٹے پر حضرت موسیٰ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیم ہیں۔ پھر مزید ارتقا شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں، اور اوپر سے احکام و فرامین براہ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔ سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھیر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہ جلال سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کر گذرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشئ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے روداد سن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں، میرا اندازہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جائیے اور کمی کے لیے عرض کیجیے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہ نے ۱۰ نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت

موسیٰ نے پھر وہی بات کہی۔ اُن کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اُتر کر بیت المقدس آئے۔ یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔ صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچازاد بہن اُمِّ ہانی کو یہ روداد سُنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انھوں نے آپ کی چادر پکڑلی، اور کہا خدا کے لیے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنائیے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لیے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔ حرمِ کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں۔ کہا قوم کو جمع کروں؟ سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟ فرمایا بے شک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کرلیا اور کہا لو اب کہو۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کردیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینہ کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن، محال! آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان تک یہ سُن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے کہ یہ محمد کے دستِ راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے گی۔ انھوں نے یہ قصہ سن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور صحیح ہوگا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں تو روز سنتا ہوں کہ اُن کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ پھر حضرت ابوبکر حرمِ کعبہ میں آئے۔ رسول اللہ موجود تھے اور ہنسی اُڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کردیا اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتارہے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ وہاں بکثرت

ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے، وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ سے گذرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلہ والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے، ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا، میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا، سب لوگ سو رہے تھے، میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور اتنے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے اُن کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟

رسائل و مسائل

مہر کے متعلق ایک ضروری مسئلہ

"اگر بوقت نکاح زر مہر کی صرف تعداد مقرر کر دی گئی اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجل ہے یا موجل تو آیا اس کو معجل قرار دیا جائے گا یا مؤجل؟ اس مسئلہ میں علماء سے استفسار کیا گیا مگر جوابات مختلف آئے۔ مثلاً چند جوابات یہ ہیں:-

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و دیگر علماء دہلی:

"اگر مہر میں موجل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بجہالت فاحشہ ہو تو مہر معجل ہو جاتا ہے۔ اور جبکہ معجل یا یا مؤجل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب الادا کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجل ہو گا کیونکہ بغیر ذکر اجل کے موجل نہیں ہو سکتا۔ الا اذا جہل الاجل جہالۃ فاحشۃ فیجب حالا۔ غایہ (درمختار) وان کانت جہالۃ متفاحشۃ کالی المیسرۃ اوالی ھبوب الریح اوالی ان تمطر السماء فالاجل لا یثبت ویجب المہر حالا۔ وکذا فی غایۃ البیان (رد المختار)"

مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ:

"مہر موجل اس وقت ہو گا جب بوقت عقد نکاح ادائے مہر کے لیے وقت اور تاریخ کی تعیین ہو ورنہ معجل۔ یہی حال تمام معاملات کا ہے۔ اگر کسی نے ایک دوکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں نقد یا تاخیر تعیین وقت کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجل کے حکم میں ہو گا، خریدار خواہ فوراً قیمت دیدے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے۔ بہر صورت معجل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فوراً ادا کیا جائے بلکہ صاحب حق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ فوراً یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور معاملہ موجلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبہ اور تقاضے

کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس تفصیل کی رو سے معاملہ مسئولہ میں زرِ مہر معجل ہے اس لیے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ اور دعویٰ کر سکتی ہے"۔

مولانا سید سلیمان ندوی:

" زرِ مہر میں اگر معجل یا موجل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ وقایہ میں ہے و المعجل والموجل ان بینا فذلک والا فالمتعارف۔ اگر معجل اور موجل دونوں بیان کر دیے گئے ہیں تو جیسا بیان کیا گیا ہے ویسا ہوگا ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا"۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نائب مفتی ریاست پٹیالہ و دیگر علماء:

" اس صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ وہی مختصر وقایہ کا ہے) اگر عرف یہ ہے کہ ایک عورت ایسے غیر مبیّن مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کر سکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے اسے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی"۔

اس اختلاف کا حل کیا ہے ؟ براہِ کرم آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں"۔

قرآن اور حدیث کی رو سے مہر در اصل اُس حقِ زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے :-

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء - ۴)	ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں، تمھارے لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض اُن سے طلب نکاح کرو۔
فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء - ۴)۔	پس جو لطف تم نے اُن سے اُٹھایا ہے اُس کے بدلے ان کے مہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔
وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (النساء - ۳)	اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جبکہ تم میں سے ایک دوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔

صحاح ستہ اور دارمی اور مسند احمد میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:

أَحَقُّ الشُّرُوطِ أَنْ تُوفُوا بِهِ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ۔

تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

لعان وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا یارسول اللہ میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

لَا مَالَ لَكَ، إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَذَلِكَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا (مسلم. کتاب اللعان)

مال لینے کا تجھے حق نہیں۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اس کے معاوضہ میں وہ مال ادا ہو چکا، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔

اس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ:

مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً بِصَدَاقٍ وَنَوَى أَنْ لَا يُؤَدِّيَهُ فَهُوَ زَانٍ

جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ یہ مہر دینا نہیں ہے وہ زانی ہے۔

ان تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمائشی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضہ میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضاء یہ ہے کہ استحلالِ فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے، الّا یہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر

کر دینے کے لیے کوئی قرارداد ہو چکی ہو۔

پس زرِ مہر کی ادائیگی کے معاملہ میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استحلالِ فرج کے ساتھ ہر وقت ادا ہو اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرارداد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی تعجیل) کا کیا جائے گا نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشا کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرح ہونے کی صورت میں زرِ مہر کو آپ سے آپ موجل ٹھیرایا جائے۔

فقہاء حنفیہ کے درمیان اس مسئلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ نہایۃ البیان میں ہے:

فان کان بشرط التعجیل او مسکوتاً عنہ یجب حالاً ولہا ان تمنع نفسہا حتی یعطیہا المہر۔

اگر مہر بشرط تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجل ہے یا موجل)، تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک لے جب تک کہ وہ مہر ادا نہ کرے۔

اور شرح العنایہ علی الہدایہ میں ہے:

فان سموا المہر ساکتین عن التعجیل والتاجیل ماذا یکون حکمہ؟ قلت یجب حالاً فیکون حکمہ حکم ما شرط تعجیلہ

پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجل یا موجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا، اس کا حکم اس مہر کا سا حکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیجابی میں ہے:

ان کان المہر معجلاً او مسکوتاً عنہ

اگر مہر معجل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو

فانه يجب حالا لان النكاح عقد معاوضة وقد تعين حقه في الزوجة فوجب أن يتعين حقها ذلك بالتسليم

تو وہ فوراً واجب ہوگا کیونکہ نکاح ایک عقد معاوضہ ہے، جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین ہوگیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر ادا کر دیا جائے۔

رہا دوسرا گروہ، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

فان لم يبينوا قدر المعجل ينظر الى المرأة والى المهر انه كم يكون المعجل لمثل هذه المرأة من مثل هذا المهر فيعجل ذلك ولا يتقدر بالربع والخمس بل يعتبر المتعارف

اگر معجل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقہ کی ہے اور مہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت کے لیے ایسے مہر میں سے کس قدر معجل قرار دیا جاتا ہے۔ بس اتنی ہی مقدار معجل قرار دی جائے۔ ایک چوتھائی یا پانچویں حصہ کی تعیین نہ کر دینی چاہیے بلکہ جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وان لم يشترط تعجيل شيء بل سكتوا عن تاجيله وتعجيله فان كان عرف في تعجيل بعضه وتاخير باقيه الى الموت او الميسرة او الطلاق فليس لها ان تحتبس الا الى تسليم ذلك القدر

اور اگر کسی حصۂ مہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل سے سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائے گا۔ اگر رواج یہ ہے کہ ایک حصہ معجل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصہ موت تک یا خوش حالی تک یا طلاق تک موخر رکھا جاتا ہے تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ مطابقت رکھتی

ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاجیل اصل ہے اور جب تاجیل تعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے، بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروج ہو اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک غیر مسطور قرارداد کی سی ہوتی ہے، اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں صراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پہلو میں وہ مروجہ طریقہ پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلّم ہے، اور اس لحاظ سے فقہاء کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطور ایک ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور اس کے غیر منصفانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں، شریعت کی روح اور اس کے اُصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو غیر مسطور قرارداد مان کر مثل قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اس کے رواج شریعت کی رُوح اور اس کے اصولوں کی تبعیت میں پیدا ہوئے ہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثل قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم ہندوستان کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقاتِ زن و شو کے معاملہ میں اس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کر کے اس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا، اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی رُوح

اوراس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملہ کو لے لیجیے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں اس کو دی گئی ہے۔ نکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصور ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے" گویا یہ فعل محض ضابطہ کی خانہ پُری کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فی صدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زرِ مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پر حلال کرتے ہیں وہ مہر کو استحلالِ فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پر حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائیٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں، اس کے عرف و رواج کو از روئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ جن فقہاء کی عبارتیں اعتبارِ عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ بگڑی ہوئی سوسائیٹی تھی اور نہ اس کے خلافِ شریعت رواج۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شدہ سوسائیٹی اور اس کے عرف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصولِ شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات میں انھوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں اُن سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج انھیں چسپاں کیا جا رہا ہے۔

"پردہ" پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

"...... کالج کے ایک ہندو پروفیسر صاحب کو میں نے آپ کی کتاب "پردہ" پڑھنے کو دی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا ہے وہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ان کے سوالات کا جواب ہم بھی دے سکتے ہیں لیکن آپ خود جواب دینے کی تکلیف فرمائیں تو یہ ان کے لیے زیادہ تسلی بخش ہوگا۔"

جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے وہ انگریزی میں ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"آپ نے جو کتاب مجھے دی تھی اسے میں نے ختم کر لیا ہے۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بڑی حد تک مصنف کے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر ہندو سوسائٹی میں ہندو عورتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس پر مصنف کی رائے زنی ہندو رسم و رواج سے ناواقفیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو قوم سیاسی حیثیت سے گر گئی ہو اس کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہندو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، تاہم کسی ہندو خاندان میں عورت کو لونڈی کی حیثیت نہیں دی جاتی جیسا کہ مصنف نے ایک جگہ بیان کیا ہے بلکہ اس کے برعکس ایک دیوی کی طرح اس کی عزت و حرمت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

مگر آپ کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ انسانی سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ ایک نامی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ تغیر قبول کرتی رہتی ہے، خواہ یہ تغیر بہتری کی جانب ہو یا بدتری کی جانب۔ ہمارے رواج، آداب و اطوار، زبان، لباس، خیالات وغیرہ ہم بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا ہمارے نقش قدم پر چلنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ غالباً وہ غلطیاں کرنے کا حق بھی مانگتے ہیں۔ میں چونکہ ایک آزاد خیال آدمی ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، اور یہی حق ایک عورت کو بھی ہے۔ پھر کیوں اس سے مطالبہ کیا جائے بلکہ بزور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے؟ مصنف نے

اپنے دعاوی کی تائید میں مغربی مصنفین کی تحریریں نقل کی ہیں، مگر یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کی سیاحت کرتا اور خود تحقیق کرتا کہ آیا ان صوبوں کی عورتیں جنھوں نے صدیوں سے کبھی پردہ نہیں کیا ہے، کسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں؟"

پروفیسر صاحب کی طرح غالباً بہت سے دوسرے ہندو بھائیوں نے بھی میری کتاب کو ملاحظہ فرمایا ہوگا اور ممکن ہے کہ ان کو بھی یہ بات بری لگی ہو گی جس کی شکایت پروفیسر صاحب نے کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پبلک میں اپنے مدعا کی تشریح کر دوں۔ ہندو سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میری مراد وہ برتاؤ نہیں ہے جو ہمارے ہندو بھائی عملاً اپنے گھروں میں اپنی بیویوں، بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں، بلکہ وہ حیثیت ہے جو ہندو قانون اور فلسفۂ اجتماع نے عورتوں کو دی ہے۔ اس چیز کا میں نے جس حد تک مطالعہ کیا ہے، میں کسی تعصب کے بغیر اس سے وہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں جو پروفیسر صاحب نے میری کتاب میں ملاحظہ فرمایا، اور میرا خیال ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی جو حضرات اصلاحِ معاشرت کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان میں سے اکثر اپنی سوسائٹی میں عورتوں کی قانونی، معاشی اور معاشرتی حیثیت کو قابلِ اطمینان نہیں پاتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بہت سی خرابیاں اس انحطاط کا نتیجہ ہیں جس میں ہندو قوم صدیوں تک مبتلا رہی ہے، لیکن آخر ان کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے جب تک کہ جرأت کے ساتھ ان کو محسوس اور متحقق نہ کیا جائے؟ میں نے اپنی کتاب میں صرف ہندوؤں ہی پر نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی مسلمان قوموں پر بھی نکتہ چینی کی ہے، اور مغربی اقوام پر تو میری تنقید بہت سخت ہے، مگر کسی قوم کے معاملہ میں بھی میری تنقید کا مقصد تحقیر اور عیب چینی نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اس غلطی پر متنبہ کروں جس میں وہ مبتلا ہے اور اس اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں جس میں مجھے اس کی فلاح نظر آتی ہے۔

پروفیسر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ نشوونما اور تغیر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اور یہ بات خود پروفیسر صاحب نے تسلیم فرمائی ہے کہ تغیر لازماً صحیح ہی نہیں ہوتا، غلط بھی

ہوتا ہے۔ اب یہ سمجھنے سے میں معذور ہوں کہ انسانی سوسائٹی یا اس کے افراد اگر غلط سمت میں تیز قبول کر رہے ہوں تو انھیں ٹھوکریں کھانے اور تباہی و نقصان کی طرف جانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جائے؟ کیوں نہ صحیح سمت کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے؟ خصوصاً جو شخص جانتا ہو کہ صحیح سمت کونسی ہے وہ اگر لوگوں کو غلط سمت میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہے تو اس کے مجرم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ میں آزادی کے اس مفہوم کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آدمی کو حماقت اور خودکشی اور سوسائٹی کی تخریب کے لیے بھی آزاد ہونا چاہیے۔

"بلکہ بزور اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے"۔ پروفیسر صاحب کا یہ فقرہ بڑا دلچسپ ہے۔ اگر جبر سے مراد مار پیٹ کر زبردستی نقاب ڈلوانا ہے تو میں پروفیسر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پیش نہ آئے گا۔ البتہ اگر زور اور جبر سے مراد سوسائٹی کی رائے اور اس کے رائج کردہ طریقوں کی طاقت ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اجتماعی زندگی اس طاقت کے استعمال سے کبھی خالی نہیں رہی ہے اور نہ کبھی خالی کی جا سکتی ہے۔ سوسائٹی کا لفظ اُس روز ہر معنی سے خالی ہو جائے گا جس روز وہ اس طاقت اور اس کے استعمال سے خالی ہو جائے گی۔ یہ آج کل کی "آزاد خیال" سوسائٹی جس میں ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر آزاد خیالی کا مدعی اور آزادیٔ رائے کے احترام کا دعوے دار ہے، اس کے دعووں کی حقیقت ایک ذرا سی آزمائش سے کھل سکتی ہے۔ ابھی کوئی شخص اس سوسائٹی میں ڈاڑھی رکھ لے، پھر آپ خود دیکھ لیں گے کہ اسے کس کس طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور کیسے کیسے فقرے اس پر کسے جاتے ہیں۔ یہ تجربہ آپ جب چاہیں کر سکتے ہیں، اس سے آپ کو بآسانی اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ "آزاد خیالی" کے اس دور میں بھی سوسائٹی کی فطرت نہیں بدلی ہے۔ وہ آج بھی افراد کی "آزاد خیالی" کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی پسند اور اپنے اجتماعی معیارِ تہذیب و ثقافت کو اسی جبر و زور کے ساتھ مسلط کر رہی ہے جس طرح ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب پرانی سوسائٹی کے کسی شخص میں ان آزاد خیال حضرات کے منشاء کے مطابق تغیر رونما ہوتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے عمل میں آزاد ہونا چاہیے، سوسائٹی کون ہوتی ہے کہ ایک آدمی کو

وہ طریقہ اختیار کرنے سے منع کرے جسے اُس نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے۔ لیکن اگر نئی سوسائٹی کے کسی شخص میں ان کے منشأ کے خلاف تغیر واقع ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کوئی آزاد خیال عورت پردے کو خود پسند کرکے نقاب اوڑھنے، یا کالج کا کوئی طالب علم "ملائیت" اختیار کرکے ڈاڑھی اور نماز کا پابند ہو جائے اور سینما اور برج اور دوسرے بیہودہ افعال سے پرہیز کرنے لگے۔ تو یہی "آزاد خیال" سوسائٹی پوری "دقیانوسیت" اور "تاریک خیالی" کے ساتھ وہ سب تدابیر اُس کے اِس تغیر کو روکنے اور اسے اپنے سابق طریقے کی طرف پھیر لانے کے لیے استعمال کرتی ہے جو پرانی سوسائٹی استعمال کیا کرتی تھی۔ بلکہ ٹرکی اور روس کے "آزاد خیالوں" نے تو اس بیسویں صدی میں "دقیانوسیت" کی حد کر دی ہے۔ "آزادی خیال" کے ان متعصب دشمنوں نے اُن عورتوں کے نقاب زبردستی نوچ نوچ کر پھینک دیے ہیں جو بے نقاب ہونا نہ چاہتی تھیں، اُن لوگوں کو زبردستی ہیٹ پہنوائے ہیں جو اپنے سروں پر چھجے دار ٹوپی نہیں رکھنا چاہتے تھے، پوری پوری آبادیوں کو لاطینی رسم الخط اختیار کرنے پر از روئے قانون مجبور کیا ہے جو عربی یا فارسی رسم الخط کی پابند رہنا چاہتی تھیں۔

پروفیسر صاحب کا آخری مشورہ قابلِ قدر ہے، مگر وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے شاید انھوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ میں تمام عمر کسی پرانے مسلمان خاندان کے ماحول میں گھرا رہا ہوں اور بس کتابوں کے مطالعہ سے کچھ رائیں میں نے قائم کرلی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے دنیا کو آنکھوں سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا ہے۔ گجرات، دکن، مہاراشٹر اور شمالی ہند میں بھی میں نے قریب قریب تمام طبقوں کے اندرونی و بیرونی حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور انہی مشاہدات نے مجھ کو بالآخر اس بات کا قائل و معترف بنا دیا کہ سوسائٹی کی اخلاقی صحت اور صالح نشوونما کے لیے معاشرت میں اُن حدود کی پابندی ضروری ہے جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جبکہ میں خود پردے کا مخالف تھا، حتیٰ کہ میں نے مصر کے ایک آزاد خیال شخص کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا جس میں اس نے "آزادیِ نسواں" کی پرزور حمایت کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ترجمہ شائع نہیں ہوا بلکہ اس کا مسودہ بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گیا اور

اس طرح میں خلق خدا کی گمراہی کا سبب بننے سے بچا لیا گیا ــــ میں نے یہ بات کبھی نہیں کہی، اور نہ ایسی بات کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جن طبقوں میں زنانہ اور مردانہ سوسائیٹی کے درمیان حد بندیاں کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ سب اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں، مگر اپنے مشاہدات کی بنا پر مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ایسے طبقوں سے اخلاقی پستی قریب تر ہے اور ان کے اس میں مبتلا ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہو جیسے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جہاں پولیس کا انتظام نہیں ہے وہاں سب چور اور ڈاکو ہی بستے ہیں، مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہاں چوری اور ڈاکے کا ارتکاب آسان تر ہے اور بدامنی پھیل جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا جتنی اہمیت رکھتا ہے، اتنی ہی اہمیت ایسے خارجی حدود و ضوابط کی بھی ہے جن سے افراد کو اخلاقی ذمہ داری کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہو۔ جو سوسائیٹی اپنے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں تدبیروں میں سے محض کسی ایک تدبیر پر اکتفا کرتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک دائمی خطرے میں مبتلا رکھتی ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کے متعلق چند اشکالات

سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں: "پہلا جز یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے ......" کیا دعوت توحید کے ساتھ رہائی بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰ نے کیا غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں: "دوسرا جز یہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں"۔ کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی

نے بھی دینِ موسوی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ حالانکہ کسی خاص سعی اور کشمکش کا پتہ قرآن پاک سے نہیں چلتا جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے لکھوکھا آدمی تمام کے تمام مشرکانہ طاقتوں کے زیر دست رہنے کے باوجود ایک دم ایمان لے آئے ہوں۔ جو برتاؤ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا وہی برتاؤ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس زمانہ کے کچھ بنی اسرائیل حکومت کی طاقت کو حرکت میں لاکر کر سکتے تھے۔ اور اگر ان میں کچھ کافر تھے تو وہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے یا نہیں؟ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔ یہ حضرت ہارونؑ کا مقولہ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لڑانے آیا ہوں۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں جو قرآن مجید کے آخری حصہ میں ملتی ہیں، یہ ذکر کیا جاچکا تھا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو خدا کی بندگی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوا ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى. وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى۔ اس میں ہانی بنی اسرائیل کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ البتہ بعد کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ منصب نبوت پر حضرت موسیٰ کے تقرر کے دو مقصد تھے۔ اول فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینا، دوسرے اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر اس مسلمان قوم کو، جو حضرت ابراہیم کے وقت سے مسلمان چلی آرہی تھی اور حضرت یوسف کے بعد چار پانچ صدیوں کے دوران میں کسی وقت کفار سے مغلوب ہوکر رہ گئی تھی، کفار کے تسلط سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ حضرت موسیٰ نے پہلے مقصد کی طرف پہلے دعوت دی اور دوسرے مقصد کو بعد میں لیا۔ دوسرے مقصد کو پہلے مقصد سے غیر متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔

یہ سوال کہ کیا سب بنی اسرائیل نے دینِ موسوی قبول کر لیا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے خیال میں بنی اسرائیل غالباً کافر تھے، اور حضرت موسیٰ شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف دعوت

دی۔ حالانکہ فی الواقع صورتِ حال یہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے بنی اسرائیل میں مسلسل چار نبی آچکے تھے اور یہ لوگ اُن کی نسل سے تھے اور آخری نبی (حضرت یوسف) کو گذرے ہوئے چار پانچ سو برس سے زیادہ نہ گذرے تھے۔ حضرت موسیٰ کی آمد کے وقت بنی اسرائیل کی حالت کو اُس حالت پر قیاس کیجیے جو مثلاً امام غزالی کے زمانہ میں مسلمانوں کی تھی۔ وہ نہ تو کافر ہوگئے تھے، نہ ان کو کفر سے اسلام میں لانے کا کوئی سوال درپیش تھا اور نہ اُن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا کوئی منکر تھا۔ البتہ ان کے اندر اتنا ضعف آگیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی قیادت میں فرعون اور اس کی قوم کی طاقت سے تصادم کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نوجوان تو حضرت موسیٰ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے بڑی حد تک تیار ہوگئے تھے لیکن ان کے سن رسیدہ و جہاندیدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موسیٰؑ کا ساتھ دینے کے معنی اپنی دنیا کو تباہ کر لینے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس حالت کا نقشہ بالکل صاف طور پر سامنے آجاتا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف۔ رکوع ۱۵۔ و سورہ یونس رکوع ۹) اس بات کا قرآن سے کہیں نشان نہیں ملتا کہ ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں سے کوئی عملاً فرعون کا ساتھ دے کر حضرت موسیٰ کی مخالفت کر رہا تھا، بلکہ قرآن اور توریت دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے مسلّمہ لیڈر بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو ایک اسرائیلی بھی پیچھے نہ رہا۔ حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں جس تنزل کو بنی اسرائیل پہنچے، اس پر بنی اسرائیل کو قیاس کرنا درست نہیں۔

حضرت ہارون نے جو کچھ حضرت موسیٰ سے کہا تھا، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اصل لیڈر اور ان کے جماعتی نظام کے ذمہ دار حضرت موسیٰ تھے اور حضرت ہارون ان کے مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں حضرت ہارون کسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والے معاملے پر کوئی فیصلہ کن کارروائی کرتے ہوئے اس بنا پر ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ان سے نہ ہو جائے جو اصل ذمہ دار شخص کی پالیسی کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔

مسیح علیہ السلام کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے، وہ بالکل دوسرے حالات سے تعلق ہے۔ اس وقت کوئی اسلامی نظامِ جماعت یہودیوں میں موجود نہیں تھا کہ حضرت مسیح کے اس قول کو یہ معنی پہنائے جاسکیں کہ آپ اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت ہارون کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظامِ جماعت موجود تھا اور وہ بجا طور پر اس امر میں احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوجائے جو اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کردے۔

قصۂ یوسفؑ میں دین الملک کا مفہوم

"مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ، میں "دین الملک" سے کیا مراد ہے؟"

اس سوال کا جواب میں اس سے پہلے ترجمان القرآن جلد ۲۱ کے عدد ۳، ۴، ۵، ۶ (مشترکہ) بابت ماہ رمضان، شوال، ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ میں تفصیل سے دے چکا ہوں۔ مختصراً یہ جان لیجیے کہ اس آیت میں دین الملک سے مراد بادشاہ کا قانون ہے جو مصر میں رائج تھا، اور مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ کے معنی یہ ہیں کہ "یوسف کا یہ کام نہ تھا کہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے تحت گرفتار کرتا"۔ اس معنی کی بکثرت نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو آیت مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ (سورہ آل عمران - ۸)۔ اسی بنا پر حضرت یوسف کے آدمیوں نے (غالباً خود حضرت ہی کی ہدایت کے مطابق) برادرانِ یوسفؑ سے دریافت کیا کہ چور کے متعلق تمھارے ہاں کا قانون کیا ہے۔ اور جو قانون انھوں نے بتایا اسی پر عمل کیا گیا، کیونکہ وہ شریعتِ ابراہیمی کا قانون تھا۔

حبشہ پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ

"مصر کے مفتوح ہوجانے کے بعد، خلافت راشدہ کے زمانہ میں حبشہ کی جانب فتوحات کے لیے قدم کیوں

نہ بڑھایا گیا؟ کیا محض اس وجہ سے کہ وہاں کے ایک سابق حکمراں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ایک سابق بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس مکمل مواد موجود نہیں ہے۔ البتہ ابوداؤد اور مسند امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرمائی تھی کہ "دعوالحبشۃ ما ودعوکم" یا "اترکوا الحبشۃ ما ترکوکم"۔ یعنی حبشی جب تک تمھیں چھوڑے رکھیں تم بھی انھیں چھوڑے رکھو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفاء راشدین کے دور میں حبشہ کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس ارشاد میں جو مصلحت تھی ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا بھی لحاظ ہو کہ اہل حبشہ نے مسلمانوں کو ان کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے حبش پر پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے وہ یہ کہ حبشہ کی جغرافی پوزیشن اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوگا کہ اسلام کے جغرافی مرکز یعنی حجاز کی حفاظت کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا سیاسی حیثیت سے ضروری ہے، لہٰذا جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُرامن طریقے سے حبش میں پھیلائی جاتی رہے لیکن جنگ سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔

مسلمان جباروں کے معاملہ میں صحیح اسلامی روش

"مولانا اسماعیل شہیدؒ اپنی مشہور تصنیف منصب امامت میں "سلطنت جابرہ" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

۱۔ "باید دانست کہ سلطان جابر عبارت است از شخصے کہ نفس امارہ بروے بحدے شورش کند کہ نہ خوف خالق مانع اومی تواند شد و نہ شرم مخلوقین، و در اجرائے مقتضیات نفس خود من حیث شرع دارد:

پابن عرف۔ ہرچہ نفس امارہ او را می فرماید، بلا تکلف آں را بجا می آرد۔ مخالفت و موافقت شرع پروا نہ دارد، بلکہ ہمیں استیفائے لذاتِ نفسانیہ را ثمرۂ سلطنت خود می شمارد۔ ہمیں را سلطنت جابرہ می گوئیم"۔

ب۔ "قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذا الامر بدء نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ ثم ملکا عضوضا ثم ملکا جبریۃ وعتوا وفسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور یرزقون علی ذلک وینصرون حتی یلقوا اللہ۔ و ایں سلطنتِ فسق و ظلم درحق امتِ ملت بلائے ست بس عظیم"۔

ج۔ "حتیٰ کہ ضعفاء و غرباء مسلمین تسلط کفار نابکار را از تسلط ایں جابرہ بہ ہزار درجہ بہتر می شمارند و آں را باعث اطمینانِ خلق اللہ می انگارند"۔

د۔ "پس قیام سلطنتِ ظالمہ مثل انتشار مذاہب باطلہ است کہ قوانین ملت را برہم می زند و آئین سنت را گم می کند"۔

ر۔ "و ہیچ اسمے از اسماء خالق اکبر نیست کہ ایں جاہل افتراءِ ذات خود را بآں لقب نہ نہادہ و ہیچ منصبے از مناصب انبیاء و مرسلین نیست کہ ایں عدوئے دین ادعائے آں نہ نمودہ"۔

س۔ "قسم ثانی آنکہ سلطانِ جابر در دل ایں قدر خوفِ الٰہی نمی دارد کہ افعال شرعیہ را باخلاص نیت بجا آرد بلکہ آنرا ہم بطریقِ رسم و عادت و نیز برائے حصول نیک نامی درمیانِ اہلِ زمان و اظہارِ مسابقت بر اقران بعمل می آرد و آں را نیز از لوازم جاہ و جلالِ خود می شمارد"۔

ص۔ "نکتۂ ثالثہ۔ سلطان بلاریب محتاج امر بالمعروف است و اظہارِ حق بحضور او افضل عبادات۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر۔ اما امر بالمعروف او را بوجہے باید کرد کہ بحدِ مخالفت و منازعت نہ کشد و بمرحد بغی و خروج نہ رسد، کہ خروج بر امام جابر

شرعاً جائز نیست۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "۔ الا من ولی علیہ والٍ فراٰہ یاتی شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزع من طاعۃ

کیا یہ حکم صحیح ہے؟ یزید کی حکومت کے خلاف حضرت حسین و حضرت عبداللہ بن زبیر نے جو کوشش فرمائیں، کیا وہ ناجائز تھیں؟ کیا حضرت حسین اس چیز میں مخطی تھے؟ جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے اپنے ایک رسالہ میں، جس کا ترجمہ "حسین و یزید" کے نام سے چھپا ہے، فرمایا ہے۔[1] اگر سلطنت جابرہ کے خلاف کوشش کرنا ضروری ہے تو دیگر صحابہ نے حضرت حسین کا کیوں ساتھ نہ دیا؟ بلکہ ان میں سے بعض تو اموی خلافت تک حیات رہے، انھوں نے کیوں کوئی جدوجہد نہ فرمائی؟

اور سلطنت ضالہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

ا۔ "در ہر امرے از امور ریاست و سیاست ملکے مخالف شرع متین ثابت بگردد و در ہر معاملہ از معاملات بنی آدم اصلے مقابل دین قائم می شود۔ پس ملتے مقابل ملت مصطفوی برپا می شود و سنتے مقابل سنت نبوی ......"

ب۔ بالجملہ ایں سیاست سلطانی، مذہبے است، غیر مذہب اسلام، و ملتے است غیر ملت سیدالانام بمثابہ سائر مذاہب باطلہ مثل ہنود و مجوس، نہ مثل شیعہ و خوارج۔"[2]

ج۔ "ہر چند امثال ایں سلاطین فی الحقیقت از قبیل اشرار کفار اند واز جنس اہل نار۔ فاما از بس کہ بزبان خود دعوی اسلام می کنند، پس کفر ایشان مستور است و ایمان ایشان ظاہر۔ و شاہد تصدیق ایں دعوائے ظاہری از رسوم اسلام مثل عقد نکاح و ختان و اظہار تجمل بروز عید الفطر و عید الاضحی

---

[1] خطاء کی وجہ غالباً تفریق شمل امت بیان فرمائی ہے۔

[2] اسلام میں ملوکیت کی گنجائش ڈھونڈنے والوں کو یہ حوالے ضرور غور سے دیکھنے چاہئیں۔ کہیں مولانا اسماعیل شہید بھی "یورپ زدہ" تو نہیں تھے؟

وتجہیز و تکفین و نماز جنازہ و دفن در مقابر مسلمین، درمیانِ خود جاری دارند"۔

د - "بالجملہ چوں سلطنتِ جابرہ بحدِ سلطنتِ ضالہ رسد، از سرحدِ فسق و ظلم در اقسام بدعتِ ضلالت داخل گردید۔ پس حکم سلاطین مضلین حکم سائر فرقِ باطلہ مبتدعین است۔ اختلافیکہ در تکفیر و عدم تکفیر مبتدعین واقع است، ہموں اختلاف در تکفیر و عدم تکفیر سلاطین مضلین متحقق"۔

س - "نکتۂ اول ...... در ریاست او بہ نسبت دین سمے است۔ قائل وامامت او بحکم کتاب و سنت وجہے است باطل۔ اما از آں جا کہ راہِ معاملۂ اسلام با او مشکوک است، تکفیر او مشکوک۔ بناءً علیہ اظہار بغی بر سے و خروج از اطاعتِ او نیز از مسائل اختلافیہ است ...... و چوں بغی و خروج بر سلاطین مضلین احتیاطاً ممنوع است، سلطنتِ ایشاں از اقسام امامت معدود ماند"۔

س - "نکتۂ ثانیہ ...... مگر آں کہ قیام خلافتِ راشدہ یا سلطنتِ عادلہ بر تعدیہ برہم زدن ریاستِ او متیقن باشد پس دریں صورت برافراختن اعلام قتل و قتال و برانداختن آں مبتدع ضال در حق ملت و اہلِ ملت منفعتے خواہد بخشید، وازاں بعوام و خواص بے شک مضرتے خواہد رسید"۔

کیا یہ شرط صحیح ہے ؟ اور کیا اس شرط کے پائے جانے پر بھی معاملہ صرف منفعت تک رہتا ہے، وجوب ثابت نہیں ہوتا ؟ حالانکہ سلطنتِ کفر کے متعلق مولانا فرماتے ہیں :-

ا - "تنبیہ رابع در بیانِ سلطنتِ کفر۔ باید دانست کہ مراد از سلطنتِ کفر دریں مقام حکومتِ کفار اصلی نیست بلکہ مقصود ازاں سلطنت قومے است کہ جان خود را در زمرۂ مسلمین می شمارند و موجبات کفر صریح بعمل می آرند۔ جہاد بر ایشاں از ارکانِ اسلام است و اعانتِ ایشاں اعانتِ بید الانام۔ پس ایں قسم سلاطین بلاشک از جنس کفار متمردین اند و از زنادقۂ مرتدین۔ کما عن والد عبادۃ ابن الصامت انہ قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لا ننازع

الا ان تروا کفرًا بواحًا عندکم من اللہ فیہ برہان "

ب۔ "و قیام سلطنت ارتداد مشابہ غلبۂ کفار است، کہ بر ذمۂ مسلمین فرض عین می شود کہ بر وجہاد قائم بگردانند و این شورش و فساد را بہ شمشیر نشانند، وگرنہ توانند از آن اقلیم ہجرت نمایند و جہاد را اعلام فرود آیند۔"

یہاں مذکورہ بالا خبر اللہ نے جہاد کو کیوں مشروط نہیں کیا؟ پھر لطف یہ کہ مولانا، خاتمہ، تنبیہ ثانی و نکتۂ ثانیہ میں متعارض ظواہر احادیث نقل فرما کر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"و تحقیق کلام دریں مقام آنست کہ ترک معاونت سلطان جابر و خلع بیعت او و اظہار خروج بر او، یا بنا بر سرزنش جرم اوست و معاونۂ ظلم او و تسکین لہب غضب کہ بسبب تعدی او افروختہ و تسلی قلب کہ بنا بر جور او سوخت، یا بنا بر حفظ ملت و نظم امت است کہ بسبب تشریح فواحش و تبدیل احکام ملت فتنہ و فساد راہ یافتہ و بسبب ظہور ظلم و تعدی نظم امت برہم رفتہ۔ پس اول بغاوت مردود است و از قبیل معاصی، و ثانی نہایت محمود است، از افضل عبادات و طاعات!"

پھر کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"پس باید دانست کہ مقصود از نصب امام حفظ احکام ملت است و نظم اجتماع امت۔"

کیا یہ پورا متعصب ہے؟ اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیے گا تو ایک مفید چیز ثابت ہوگی۔

مولانا اسمٰعیل شہید کی جن عبارات کو آپ نے نقل کیا ہے اور ان کے متعلق جو سوالات کیے ہیں، اُن کے بارے میں میری تحقیق یہ ہے کہ جہاں تک کفار کی حکومت کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو صاف ہے، یعنی اس حکومت کو اسلام کی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد تمام جائز طریقوں سے کی جانی چاہیے۔ البتہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حکومت کے معاملے میں احتیاط ضروری ہے تاکہ ایک خرابی کو مٹانے کی کوشش میں کوئی اس سے بڑی خرابی رونما نہ ہو جائے۔ یہ امر کہ نصیحت اور تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اصلاح کی کوشش کی جائے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ یہ امر کہ بگڑے ہوئے نظام کو بزور درست کرنے کی کوشش کی جائے، اس میں اختلاف رونما ہوا ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، جو شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس بگڑے ہوئے نظام کو بدل دینے کے لیے کافی قوت رکھتا ہے اور جس کی نیت اپنے لیے حکومت حاصل کرنا نہ ہو بلکہ شریعتِ الٰہی کی حکومت قائم کرنا ہو، اس کے لیے اٹھنا اور جدوجہد کرنا فرض ہے، نہ کرے گا تو گنہگار رہے گا۔ اور جسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اصلاحِ حال کی قدرت نہیں رکھتا اور ظالم حکومت کے مقابلہ میں خروج کا نتیجہ بجز فساد کے اور کچھ نہ ہو گا، اس کے لیے خروج کرنا جائز نہیں ہے اور احق یہی ہے کہ یا تو وہ پرامن طریقوں سے اصلاح کی کوشش کرے یا گوشہ نشین ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایات اس سلسلہ میں ملتی ہیں، وہ میرے اخذ کردہ دونوں نتیجوں کی تائید میں ہیں۔ ایک طرف حضور یہ فرماتے ہیں:

ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی الا کان من امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ۔ ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یؤمرون۔ فمن جاھدھم بیدہ فھو مومن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مومن، ومن جاھدھم بقلبہ فھو مومن ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل۔

"مجھ سے پہلے جو انبیاء اپنی اپنی امتوں میں آتے رہے ہیں ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا گیا ہے کہ ابتداءً ان کی امتوں میں ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو ان کی سنت پر چلتے اور ان کے احکام کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے گئے جو وہ باتیں بناتے تھے جن پر ان کا عمل نہ تھا اور وہ حرکتیں کرتے تھے جن کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف جو ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں ان سے نفرت رکھے اور ان کے زوال کا آرزومند ہو) وہ بھی مومن ہے اور جہاں یہ بھی نہ ہو وہاں ایک رائی کے دانہ برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

دوسری طرف فرماتے ہیں:-

یکون بعدی ائمۃ لا یھتدون

میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو نہ میری ہدایت پر چلیں گے

بهدای ولا یستنون بسنتی وسیقوم فیهم رجال قلوبهم قلوب الشیاطین فی جثمان انس. قال حذیفة: قلت "کیف اصنع یا رسول الله ان ادرکت ذلک؟" قال "تسمع وتطیع الامیر وان ضرب ظهرک واخذ مالک، فاسمع واطع"

نہ میری سنت کی پیروی کریں گے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جن کے دل انسانی قالب میں شیطانوں کے سے دل ہوں گے۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو کیا کروں؟ فرمایا امیر کی سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ تمھاری پیٹھ پر کوڑے برسائے جائیں اور تمھارا مال چھین لیا جائے تب بھی سنو اور اطاعت کرو۔"

اور تیسری طرف یوں فرمایا:

یوشک ان یکون خیر مال مسلم غنم یتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن۔

ایک وقت آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتا رہے گا۔

ان تینوں قسم کی احادیث سے (جن کے مضمون میں متعدد اور احادیث ملیں گی) اگر وہ نتیجہ نکالا جائے جو میں نے بیان کیا ہے، تو پھر یہ باہم متعارض حدیثیں ہیں۔ ان کا تعارض اگر رفع ہو سکتا ہے، تو وہ صرف اس تاویل سے کہ تین مختلف ہدایات دے کر مسلمانوں کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر صاحب عقل و بصیرت آدمی اپنے لیے خود راہِ عمل تجویز کر سکے۔ امام حسینؓ اور ان کی طرح متعدد حضرات نے پہلی حدیث پر عمل کیا، کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان حالات کو بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تجربے سے ان کا اندازہ غلط نکلا۔ بعض دوسرے بزرگوں نے دوسری حدیث پر عمل کیا اور وہ پُرامن طریقوں سے اصلاحِ حال کی کوشش کرتے رہے اور مصائب جھیلتے رہے۔ بعض بزرگوں نے تیسری حدیث پر عمل کیا اور وہ اپنے دین کو اپنی ذات کی حد تک بچانے کے لیے گوشہ گیر ہو گئے۔

فوٹو کا مسئلہ

"میرے ایک فوٹوگرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو امتناعی حکم دیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا۔ بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے۔ کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جاسکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے؟"

فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنہ کی موجب بنی ہے۔ اب چونکہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس کو کس طریقہ سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ طریقہ خواہ سنگ تراشی ہو یا موقلم یا عکاسی یا اور کوئی جو آئندہ ایجاد ہو، بہرحال وہ ناجائز ہی رہے گا کیونکہ یہ سارے طریقے اصل فتنہ کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔ پس فوٹوگرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا اور ممانعت چونکہ جاندار اشیاء کی تصویروں کی ہے، اس لیے تمام تصویریں حرام رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔ اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثناء ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو اور ایسا کرنا کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لیے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ، پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لیے تصویریں محفوظ کرنا، اور ڈاکٹروں کا علاج کے لیے، یا فن طب کی تعلیم کے لیے مریضوں کی تصویریں لینا، نیز فن جنگ میں جہاں فوٹوگرافی کا استعمال جنگی کارروائیوں کے لیے ناگزیر ہے، حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائے گا، بشرطیکہ وہ غرض جس کے لیے اس استثناء سے فائدہ اٹھایا جارہا ہو، بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں، یہ سب قطعی ناجائز ہیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو اس خطرہ سے بہت قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ

اجلاس میں گاندھی جی کا باون فٹ لمبا فوٹو اور پولینڈ پر روسی قبضہ کے بعد ہی اسٹالین کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا اور جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور ہسپتال میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، سینما میں بادشاہ کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا، یہ سب بت پرستی کی جڑیں ہیں، اور اسی لیے اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔ میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں بینے کو بھی اسی لیے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنہ کی موجب بن جائے۔ کنھیا جی کی بچپن کی تصویر آج تک پُج رہی ہے۔ لہٰذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کریں۔

"انٹرنس کے امتحان میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت امتحان کے لیے درخواست کے ہمراہ فوٹو ارسال کرنا لازمی ہے۔ پھر کیا ایسی صورت میں فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت العلماء نے اس صورت کو جائز فرمایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل جائز کیونکر ہو سکتا ہے؟"

اس معاملہ میں مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب کے فتوے سے اتفاق ہے۔ فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی نقصان سے بچنے یا کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے۔ امتحانات کے سلسلہ میں چونکہ یہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکا دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لیے بھیج دیتے ہیں، اس لیے

درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پورا کرنا مشکل ہے اور دھوکے اور فریب کا سدباب بھی ضروری ہے لہٰذا اس مقصد کے لیے تصویر کھنچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، جرائم کی تحقیقات، طبی ضروریات، جہاد اور ناگزیر تعلیمی ضروریات کے لیے فن تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصول فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات

راجہ کی غائبانہ سلامی

"سکول میں ڈرل کے بعد ہمارا راجہ صاحب کی سلامی بینڈ پر اُتاری جاتی ہے۔ یہ غائبانہ سلامی ہے اور اسے وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بندے کو خدا کی معبودیت میں شریک ماننے سے قولاً و عملاً انکار کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے غور کے لیے مہلت دی ہے۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں۔"

آپ سلامی تو بہر حال نہ دیں، خواہ انجام کچھ بھی ہو، لیکن اپنی حد تک اس معاملہ کو بخیر و خوبی ٹلنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو بہت ٹھنڈے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ وہ اس معاملہ کو طول دینے سے خود احتراز کرے۔ اگر آپ سلامی کے موقع پر ٹل جایا کریں اور ہیڈ ماسٹر اس کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کرتا رہے تو بات چھوٹی رہے گی، لیکن اگر وہ مجبور کرے گا اور آپ کے انکار پر باز پرس کرے گا تو کیا عجب کہ بات طول کھینچ جائے، اور نہ صرف آپ کے مدرسہ میں بلکہ ساری ریاست میں اس کا اثر پھیل جائے۔ یہی پہلو آپ ہیڈ ماسٹر کو سمجھا دیجیے گا۔ اگر عقلمند ہو گا تو وہ خود خاموشی اختیار کرے گا، ورنہ اس کو آخری مرحلہ تک پہنچ جانے دیجیے، اور سمجھیے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اس ریاست میں اس پیغام کو پھیلانے کا ایک موقع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت پیش آجانے کے بعد اپنے آپ کو اچھی طرح تول لیجیے کہ پھر ذرہ برابر کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے۔ خواہ ملازمت سے برطرفی کی نوبت آئے یا ریاست سے اخراج کی۔ میں بھی آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔

مطبوعات

تاریخ افکار و سیاسیاتِ اسلامی تالیف جناب عبدالوحید خاں صاحب بی اے ایل ایل بی۔ ضخامت ۶۰۰ صفحات۔ قیمت فی جلد ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ: ۹ ع لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

اس کتاب میں اسلام کے معیار کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کا محاسبہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اس معیار کے لحاظ سے پچھلی تیرہ صدیوں میں ہمارا کارنامہ کس حد تک اور کن کن پہلوؤں سے کوتاہ رہا ہے، کوتاہی کے اسباب کیا رہے ہیں، کہاں کہاں سے کس کس شکل میں خرابیاں آئیں اور ان کے اثرات کیا ہوئے، اصلاح کے لیے مختلف ادوار میں کیا کوششیں کی گئیں، اور آیندہ احیاءِ ملت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

جہاں تک نفس موضوع اور اس کے مقصد اور اس کی ضرورت کا تعلق ہے، کسی صحیح الفکر مسلمان کے لیے اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ایک کڑوا گھونٹ ہے لیکن اسے حلق سے اتارنا ہی پڑے گا اگر ہمیں تجدید و احیاءِ دین کی راہ میں واقعی کوئی قدم اُٹھانا ہے۔ ظاہر ہے کہ پچھلے زمانہ کے مسلمان اہل سیاست، اہلِ عسکر، اہلِ دولت، اہلِ علم، اہلِ فکر و اہلِ قلم، اہلِ سجادہ و خانقاہ اور عوام جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سب کا سب سراسر حق اور عین مطابق اسلام تو نہ تھا، غلطیاں اور کوتاہیاں بہر حال انھوں نے کیں، ان کے ہر طبقے نے کیں، نہ کی ہوتیں تو آج مسلمان اس حال کو پہنچتے ہی کیوں۔ پھر اگر ہم اُن کی چھوڑی ہوئی میراث میں سے صحیح اور غلط، اچھے اور بُرے، مفید اور نقصان دہ عناصر کو الگ نہ کریں، اور اسلاف پرستی کے غلط جذبہ سے پاک ہو کر گذشتہ نسلوں کی اچھی چیزوں کی قدر کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ان کی غلطیوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے اور ان کے بُرے اثرات کو دور کرنے کی بھی کوشش نہ کریں، تو آخر اصلاح کیونکر ہو اور نصب العین

کی طرف قدم کیسے بڑھے۔ اسلاف پرستی کی نظر سے تاریخ کو دیکھنے اور سرا پنے اور اگلوں کی چھوڑی ہوئی پوری میراث کو عقیدت کے ساتھ سر پر اٹھا لینے کا نتیجہ آخر اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ پہلے سے ہوتا آیا ہے وہی آئندہ بھی ہوتا رہے اور تاریخ جس راستہ پر چلتی ہوئی موجودہ انحطاط کے مقام تک ہمیں لائی ہے اسی پر ہم آگے مزید انحطاط کی طرف بڑھتے چلے جائیں؟ پس جہاں تک نفس تنقید کا تعلق ہے اس معاملہ میں مؤلف کا اقدام بجائے خود قابل قدر ہے، اور وہ لوگ جو اس اقدام کو "نعن اخرھذہ الامۃ اولھا" کا مصداق قرار دے کر مولف کو اس بات پر مطعون کر رہے ہیں کہ اس نے سرے سے اگلوں پر تنقید کی جرأت ہی کیوں کی، ان کو ہم ہرگز حق بجانب نہیں سمجھتے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ مولف نے جو کام اپنے سر لیا ہے اس کے لیے اُس سے بہت زیادہ علم و واقفیت اور حزم و احتیاط کی ضرورت تھی جس کا اظہار ان کی کتاب سے ہو رہا ہے۔ انھوں نے حقائق دین کے بیان میں اکثر جذباتی اور جوشیلی شاعرانہ زبان استعمال کی ہے جو ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ تاریخی حیثیت سے ان کا بیان متعدد مقامات پر غیر صحیح ہے، اور بحیثیت مجموعی اچھا خاصا مبالغہ آمیز ہے۔ ایک عام ناظر ان کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں چند گنتی کے افراد کو مستثنیٰ کر کے ساری امت گمراہ رہی ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز نگاہ میں کھٹکتی ہے وہ کتاب کا وہ حصہ ہے جس میں تفسیر، حدیث اور فقہ پر بحث کی گئی ہے۔ ان موضوعات پر اول تو براہ راست معلومات حاصل کرنے کے ذرائع مؤلف کو حاصل نہ تھے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان پر قلم نہ اٹھاتے لیکن اس پر مزید بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے حصول معلومات کے لیے جن ذرائع پر اعتماد کیا وہ سب سے کم قابل اعتماد ہو سکتے تھے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حصہ لکھ کر مؤلف نے خود اپنے آپ کو بھی ان غلط کاروں میں شامل کر دیا جن پر نکتہ چینی کرنے کے لیے انھوں نے قلم اٹھایا تھا۔

ان کمزوریوں کے باوجود یہ کہنا ظلم ہوگا کہ ساری کتاب غلط ہے یا اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہے جس کے لیے مؤلف نے اسے لکھا ہے۔ اگر کوئی شخص خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول کو ملحوظ رکھ کر اس کا مطالعہ کرے تو اس سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

اسلامی پارٹی کا آئین تالیف عزیز ہندی صاحب۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ۸؍۔ مکتبۂ زرافشاں، لاہور۔

جناب عزیز ہندی نے "خلافت الٰہیہ" کے قیام کو بطور ایک نصب العین کے سامنے رکھ کر اس کی طرف پیش قدمی کے لیے دو بڑے مرحلے تجویز کیے ہیں۔ ایک مرحلہ وہ جس میں اس مقصد کے لیے جد وجہد کی جائے۔ دوسرا مرحلہ وہ جس میں مقصد کو پہنچ کر عملاً نظام خلافت قائم کرنے کا سوال درپیش ہو۔ زیر بحث کتاب میں انھوں نے صرف پہلے مرحلہ سے بحث کی ہے اور اس میں وہ ایک آئین پیش کرتے ہیں جس کے متعلق ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قیام خلافت کی جد وجہد کے لیے اگر کوئی اسلامی پارٹی بن سکتی ہے تو وہ صرف اسی آئین پر بن سکتی ہے۔ رہا دوسرا مرحلہ تو اگرچہ انھوں نے اس کو اپنی ایک دوسری کتاب کے لیے اٹھا رکھا ہے، تاہم یہ خبر اطمینان بخش ہے کہ "اس دَورِ اخریٰ" کے لیے بھی وہ ایک دستور العمل مرتب فرمائیں گے۔ سر دست جو آئین انھوں نے جد وجہد کرنے والی پارٹی کے لیے مرتب کیا ہے اس کو وہ اپنے مذکورۂ بالا دعوے کے باوجود، غالباً ازراہِ انکسار، ابھی صرف مسودہ کی حیثیت میں "ملتِ اسلامیہ کے افراد اور جماعات" کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس پر جو "تنقیدات اور جرح وتعدیل" ہوں گی ان کی روشنی میں وہ اسے دوبارہ مکمل کریں گے۔ پھر اگر کوئی جماعت اس آئین کو اپنا آئین نہ بنائے گی تو وہ خود اس پر ایک جماعت بنائیں گے۔

اس آئین کو ہم نے اشاعت سے پہلے بھی دیکھا تھا اور اشاعت کے بعد پھر دیکھا۔ جہاں تک مقصد کا تعلق ہے اس کا مقصد عین ہمارا مقصد ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی آئینی تفصیلات اور

اصولی بحثوں کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک ژولیدگیٔ فکر، ژولیدگیٔ بیان، اور غیر عملی تخیل سے لبریز ہیں اور اکثر مقامات پران میں علمِ دین سے ناواقفیت کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمیں امید نہیں کہ یہ کتاب مسلمانوں کے صاحبِ فکر طبقوں کو کبھی متاثر کر سکے گی۔ اگرچہ عزیز صاحب کی قربانیاں ناقابلِ انکار ہیں اور ان کی دماغی صلاحیتیں بھی ایک حد تک قابلِ قدر ہیں، مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا اندازہ کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اور اسی لیے وہ اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو بیشتر ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جو ان کی سطح سے بہت اونچے ہیں۔ "قلب و نظر کا جو انشراح" ان کو حاصل ہوا ہے اس میں صرف ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ انھیں "معرفتِ نفس" کی دولت بھی عطا فرما دے۔

دینِ اسلام | از چودھری افضل حق مرحوم)۔ ناشران: تاج کمپنی۔ لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

اس کتاب کو خدا کے مقدس دین کا "سراپا" کہنا چاہیے۔ اس میں اسلام کے ایک ایک عضو پر نظر ڈالی گئی ہے اور بنیادی عبادات کے آئینے میں قرآن کی پوری تعلیمات کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے خصوصاً نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ کو ہماری حیاتِ اجتماعیہ سے جو تعلق ہے، اسے جا بجا واضح کیا گیا ہے۔

دین کے ٹھوس حقائق کو "افسانوی ادب" کے لباس میں پیش کرنا چودھری صاحب مرحوم کا خاص حصہ ہے اور آپ کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی اس دعوے پر ایک بولتی چالتی دلیل ہے۔ لیکن یہ ادب، ادیب کو لکھتے وقت اور قاری کو پڑھتے وقت کبھی کبھی ایک ایسی فضا میں پہنچا دیتا ہے جہاں رنگینیٔ افکار، حقائق سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو پیش کرنے کے لیے قرآنی زبان سے ملتی جلتی زبان ہی موزوں ہے۔

قارئین کے لیے یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ آج کل سرمایہ دار اور متوسط طبقہ کو ہر جرم کا مجرم

سمجھنے اور اس کے برعکس مزدور اور دہقان کو فرشتہ قرار دینے کا جو جنون کار فرما ہے، اس کی چیرہ دستیوں سے کتاب "دین اسلام" بھی بالکلیہ محفوظ نہیں ہے۔

آسان حدیث یا انمول موتی | مرتبہ مولوی محمد شعیب صاحب، رکن مجلس العلماء، بھوپال۔ قیمت فی قسط ۱؎ر۔ ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد خاں صاحب سوداگر۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال۔

یہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کا ایک سلسلہ ہے جن میں عام مسلمانوں کے لیے سلیس اردو زبان میں احادیث نبوی کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہر رسالہ میں ایک خاص نوعیت کی چند احادیث اور ان کے ساتھ ایک توضیحی مقدمہ (جو بعد ختم خواجگان "مجلس العلماء کے سامنے پڑھا جا چکا ہے) درج ہے۔ دین کے اصل سرچشمے سے مسلمانوں کی دوری، بے نیازی کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ فرامین رسالت کو اردو زبان میں شائع کر کے اس دوری کو کم کرنے کی سعی کرنا ایک مبارک سعی ہے اور مولوی محمد شعیب صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے عوام تک حدیث کا علم پہنچانے کے لیے ایک مناسب قدم اٹھایا ہے

پیارے نبی کی اچھی اچھی باتیں | مرتبہ مولوی محمد شعیب صاحب رکن مجلس العلماء۔ بھوپال۔ قیمت فی قسط (کاغذ قسم اول) ۱۰ر (کاغذ قسم دوم) ۸ر

یہ بھی ترجمۂ احادیث کا ایک مفید سلسلہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے مرتب کیا جا رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کا انتساب کسی "شہزادے" کی تقریب سالگرہ سے نہ کیا جاتا۔

سلسلہ اشاعت حدیث شریف | مرتبہ مولوی محمد شعیب صاحب رکن مجلس العلماء۔ بھوپال۔ قیمت فی رسالہ ۱۰ر

ترجمۂ احادیث کے اس سلسلے میں نماز کے ساتھ تعلق رکھنے والی احادیث جمع کی گئی ہیں، جن کے مطالعے سے عام مسلمان نماز جیسے اہم ترین رکن اسلام کے متعلق چھوٹے بڑے مختلف مسائل کو خود سمجھ سکتے ہیں۔

تسہیل الترتیل ازالیاس برنی صاحب۔ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔قیمت عہ/۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔حیدرآباد (دکن)

۱۹۲ صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں نہایت قابلیت کے ساتھ ترتیل کے پورے قواعد کو سمیٹا گیا ہے۔پھر ہر قاعدے کی توضیح اور اس کا استعمال سمجھانے کے لیے قرآن کریم کی آیات وکلمات کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ابواب وفصول کی تقسیم اور عنوانوں کی ترتیب، مولف کے ماہر فن ہونے پر شاہد ہے۔موصوف نے کتاب کی تیاری سے پہلے فن قرأت وتجوید کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے،ان کی ایک فہرست دی ہے، تاکہ جو لوگ اس فن کا وسیع مطالعہ کرنا چاہیں انھیں آسانی ہو۔

مسلمانوں میں "قرآن پڑھنا" تو بفضلہ تعالی کسی قدر باقی ہے، البتہ صحت کے ساتھ پڑھنا صرف خواص تک محدود ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو زبان میں ترتیل کے متعلق کوئی آسان کتاب موجود نہیں تھی۔بحمداللہ تسہیل الترتیل نے اس کمی کو پورا کردیا ہے۔اب یہ قرآن کے شیدائیوں کا کام ہے کہ وہ اس کی قدر کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔خاص بات یہ ہے کہ پیش نظر (دوسرے) ایڈیشن کے جتنے نسخے قیمتاً دیے جائیں گے، اُن سے فراہم ہونے والی رقم اہل مدینہ کی امداد میں صرف ہوگی۔کاغذ، کتابت، طباعت اور سر ورق قابل تعریف ہیں۔

مسلمان بچوں کی پہلی کتاب ازمقبول احمد سیوہاروی۔قیمت ۴ھ/ ملنے کا پتہ:۔ اسلامی کتاب گھر۔سیوہارہ۔ضلع بجنور (یو۔پی)

مسلمانوں کو "نہ کافر نہ غازی" کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لیے جہاں دوسرے متعدد ذرائع سے کام لینا ہے وہاں ایک نئے نظام تعلیم کی بھی شدید ضرورت ہے ـــــ ایک ایسا نظام تعلیم جو دین اور دنیا کے درمیان دیوار بن کر کھڑا نہ ہوجائے، بلکہ ہماری نوخیز نسل کو اس طرح تیار کرسکے کہ وہ دنیا کے پیچیدہ مسائل کی گرہوں کو دین کے ناخن سے کھول سکیں۔نئے نظام تعلیم کی تشکیل کا صحیح

طریقہ تو یہ ہے کہ پہلے ایک خدا پرستانہ نظریۂ تعلیم پیدا کیا جائے پھر اس کی مدد سے اپنی ضروریات کے مطابق مخصوص نوعیت کے اصولِ تعلیم اور طریقہ ہائے تعلیم وضع کیے جائیں۔ سب سے آخر میں نصاب بنایا کیا جائے۔ لیکن حالات کا شدید تقاضا سوچنے کی مہلت نہیں دے رہا ہے، اور لوگ مجبور ہیں کہ فوراً ہی نصاب کی طرف توجہ کریں۔

مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے تدوینِ نصاب کی متعدد کوششیں ہو چکی ہیں۔ یہ مختصر سی کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں بچوں کے نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر تفہیمِ مطالب کے لیے ایک جدید اندازِ بیان اور دلچسپ عبارت سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اصلاح نصاب کی خارجی ہیئت سے تعلق رکھتی ہے۔ رہی داخلی اصلاح، سو اس کی طرف مصنف نے کوئی توجہ نہیں کی۔ داخلی اصلاح سے ہماری مراد یہ ہے کہ دینیات کو دوسرے "دنیوی" مضامین سے علیحدہ جو حیثیت دی گئی ہے، اسے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ دینیات کو تو پورے نصاب کی رگوں میں خون بن کر دوڑنا چاہیے۔ لیکن پیشِ نظر کتاب میں اسے نظامِ تمدن سے اتنا بے تعلق بنا کر پیش کیا گیا ہے گویا "دین" خدا اور بندے کے درمیان پوجا پاٹ کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔

ان اہم ترین نکات کو نظر انداز کر دینے کے بعد کتاب کے حسبِ ذیل مضامین دل کو بہت اپیل کرتے ہیں: (۱) خدا کی پہچان۔ (۲) سمجھو۔ (۳) پھر سمجھو۔ (۴) اسے خدا تو نے ہی سب کچھ بنایا ہے۔ (۵) مسجد۔ (۶) اذان۔ (۷) وضو۔ (۸) ہم مسلمان ہیں۔ لیکن مضمون "ہمارے محمدؐ" پر پہنچ کر قاری پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ کیا اعتقادی زہر بچوں کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ مثلاً

فرش بچھا ہے آپ کی خاطر عرش سجا ہے آپ کی خاطر

- - - - - - - - میرے محمد میرے سہارے!

دائیں بائیں، آگے پیچھے آپ ہی رہنا ساتھ ہمارے

- - - - - - - -

اب تو بلالو اپنے دوارے

شاعرانہ خیالی آرائیوں کی یہ خوراکیں بچے کے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لیے مسموم کر دیں گی!
آگے چل کر تو اور بھی غضب ڈھایا گیا ہے۔ یعنی بچے کو نماز سے یوں متعارف کرایا جا رہا ہے کہ
یہ "سپاہی" بنانے کا پروگرام ہے۔ اس مادی نظریے کے نیچے دبی ہوئی "تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ
الْمُنْكَرِ" کی حقیقت کراہ رہی ہے، لیکن اسے گوش شنوا نصیب نہیں ہوتا۔

کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق اور ترتیب مضامین پسندیدہ ہے۔

بولتا قاعدہ | شیخ چاند محمد صاحب۔ بی۔ اے۔ قیمت حصہ اول ۱؍، حصہ دوم ۱؍۔
ملنے کا پتہ:۔ منشی بک اسٹال، ڈاناکو روڈ، راجکوٹ۔ یا۔ دفتر "منادی"، دہلی۔

اس نو ایجاد قاعدے میں حروف تہجی اور ان کے جوڑ سکھانے کے لیے خلاف توقع کوئی
بالکل نیا طریقہ تو اختیار نہیں کیا گیا، البتہ مروجہ طریقے کو کسی قدر بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور
کوشش یہ کی گئی ہے کہ بچے بہت کم وقت میں چھوٹے موٹے جملے پڑھنے اور بولنے کے قابل ہو جائیں۔
دیباچہ میں استاد صاحبان کے لیے اس قاعدے کا طریق استعمال مختصراً درج کر دیا گیا ہے۔ یہ سمجھ
میں نہ آسکا کہ اس کا نام "بولتا قاعدہ" کس مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ ہمیں تو اس کے اندر صفت نطق
کہیں نظر نہ آئی۔

قدسی | از نفیس خلیلی صاحب۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ تاج کمپنی۔ لاہور۔

جناب نفیس خلیلی صاحب ایک معروف شاعر ہیں۔ آپ کے شہباز شاعری نے پرواز کے لیے
"سیرت النبی" جیسی پاکیزہ فضا پسند کی ہے۔ موصوف تین حصوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی
کو پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ جن میں سے پہلا حصہ "قدسی" کے عنوان سے پیش نظر ہے جس میں آنحضور

کے بچپن کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ انتساب اور تمہید کو چھوڑ کر باقی کتاب حسب ذیل چھ حصوں میں منقسم ہے:- (۱) حق گوئی و بے باکی۔ (۲) پیدائش۔ (۳) آٹھ برس کی عمر میں۔ (۴) بارہ برس تک۔ (۵) سفر شام۔ (۶) بحیرا راہب۔

آنحضورؐ کی سیرت مطہرہ لباس شعر میں اثر انگیز اور جوش افزا تو ضرور ہو گئی ہے، لیکن بعض ایسے مقامات سامنے آتے ہیں جہاں شاعر "شعر" ہونے کے باوجود اپنے خیالات کی کماحقہ عکاسی پر قادر نظر نہیں آتا، اور اس کوشش میں اشعار "شعریت" سے محروم ہو ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ شکایت بھی بے جا نہ ہو گی کہ کہیں کہیں ہلکی ہلکی "شاعری" بھی کی گئی ہے۔

رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے سوانح نگار یا سیرت نگار کو قلم اُٹھانے سے پہلے جتنی تحقیق کرنی چاہیے کتاب اتنی تحقیق کی گواہی نہیں دیتی۔ امید ہے کہ آئندہ حصص میں اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ زبان ایسی ہے کہ بچے اور عورتیں بھی استفادہ کر سکیں، کتابت، کاغذ اور سرورق موجودہ حالات کے لحاظ سے کافی اطمینان بخش ہیں۔

اعلان

ہماری زیر طبع مطبوعات میں سے مندرجہ ذیل کتب چھپ کر آ گئی ہیں، جن حضرات کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں:-

رسالہ دینیات (عہ)۔ سلامتی کا راستہ (۵/)۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (۵/)۔ اسلام کا نظریہ سیاسی (۵/)۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل (۵/)۔ اسلام اور جاہلیت (۵/)۔ نیا نظام تعلیم (۵/)۔

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and Dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price Re. 1-8. Available from The Manager, Tarjuman-ul-Quran, Lahore.

رسالۂ دینیات

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۲/ محصولڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

ادارۂ ترجمان القرآن، جمال پور - پٹھانکوٹ

سرت سروق پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	علاوہ
بے جلد ۱-۰-۰	بے جلد ۲-۰-۰	بے جلد ۱-۸-۰	محصول ڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)